عرب دنیا کے نامور محقق ڈاکٹر مصطفےٰ سباعی مرحوم کی کتاب

اَلْمُسْتَشْرِقُوْنَ وَالْاِسْلَام

کا اردو ترجمہ

اِسلام اور مُستَشرِقینؒ

ترتیب و ترجمہ

مولانا سلمان شمسی ندوی

ادارہ اسلامیات

۱۹۰- انارکلی ○ لاہور

پہلی بار عکسی طباعت ——— جون ۱۹۸۲ء

باہتمام ——— اشرف برادران سلمہم الرحمٰن

طباعت ——— اللہ والا پرنٹرز، لاہور

ناشر ——— ادارۂ اسلامیات لاہور

قیمت ——— مجلّد گردپوش ۱۰/۵۰ روپے

ملنے کے پتے

ادارۂ اسلامیات ○ ۱۹۰ انارکلی لاہور نمبر ۲
دارالاشاعت ○ اردو بازار کراچی نمبر ۱
ادارۃ المعارف ○ دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴
مکتبۂ دارالعلوم ○ دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اے اللہ!

تیرے دین کی خدمت

سمجھتے ہوئے

تیری بارگاہ میں پیش ہے۔

قبول فرما!

فہرست مضامین

۱	تعارف استاذ سید محمد رابع حسنی ندوی سکریٹری مجلس تحقیقات ونشریات اسلام	۵
۲	حرفِ اوّل	۷
۳	مغربی مستشرقین کے فکر و فلسفہ کا اثر	۱۱
	(ضمیمۃ الکتاب) مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی	۱۰
۴	تاریخی پس منظر	۲۸
۵	مقاصد اور وسائل	۳۷
۶	دینی وسیاسی مقاصد	۴۲
۷	رسائل وتصنیفات	۴۶
۸	صحافت	۴۹
۹	مشہور مستشرقین اور ان کی تصنیفات	۵۱
۱۰	مستشرقین کا معیارِ بحث	۷۱
۱۱	مستشرقین سے ملاقاتیں	۸۰
۱۲	حرفِ آخر	۹۴
۱۳	ڈاکٹر مصطفےٰ السباعی مرحوم (تعارف و حالات)	۱۰۱

تعارف

از مولینا محمد رابع حسنی ندوی سیکریٹری مجلس تحقیقات و نشریات اسلام

دورِ آخر میں دنیا کی غالب اور وسیع زبانوں میں اسلام کا تاریخی و ثقافتی تعارف ایسے اہلِ علم کے قلموں سے ہوتا رہا جن کو نہ اسلام سے تعلق تھا اور نہ مسلمانوں سے اخلاص وحسنِ ظن، بلکہ ان کے ذہنوں میں صدیوں کی وہ نفرت و عداوت بیٹھی ہوئی تھی جو صلیبی جنگوں کا تعارف کرانے والے مسیحی ادب و تاریخ میں پیوست رہی ہے۔ یہ اہلِ علم اصطلاحاً مستشرقین کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں اور یہ عام طور پر یہودی اور عیسائی رہے ہیں۔

اسلام اور مسلمانوں کے یہ غیر مخلص اپنی تحقیقی کاوشوں، علمی موشگافیوں، تاریخی نکتہ سنجیوں اور تحقیق و طرز بیان میں اپنی ظاہری دیانت داریوں سے اپنے پڑھنے والوں کو خاصی حد اور خاصے وقت تک متاثر کرتے رہے ہے۔ ان متاثر ہونے والوں میں مشرقی ممالک کے جدید تعلیم یافتہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے مستشرقین کی علمی بحث و تحقیق کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا اور ان کی

کتابوں کو تعارفِ اسلامی کا معتبر ترین ذریعہ اور واحد ماخذ سمجھا، پھر اسی اعتبار سے ان سے استفادہ کیا اور ان کو اپنی تحقیق و مطالعہ اور اپنے علمی و فکری نقطہ ہائے نظر کی بنیاد بنایا۔ اس کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب کے متعلق موجودہ تعلیم یافتہ ذہنوں میں عمومی تشکیک اور بے وقعتی پیدا ہوئی جس سے صحیح النظر مسلمان طبقہ کے دل بہت فکرمند ہوتے اور اس کے متعدد افراد نے اپنی تحریروں اور کتابوں میں اس کی طرف توجہ دلائی۔ ان میں خاص طور پر ڈاکٹر مصطفےٰ سباعی قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے اپنی کتاب "السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی" میں اس بات کا واضح تذکرہ کیا ہے۔

ہمارے عزیز مولوی سلمان شمسی ندوی نے ڈاکٹر سباعی مرحوم کے مذکورہ بالا موضوع پر مضامین دیکھے اور ان کی خواہش ہوئی کہ اردو داں طبقہ کی نظروں کے سامنے اس کو لائیں چنانچہ انھوں نے ان مضامین کا ترجمہ کیا اور اس میں دوسرے اہلِ علم کی بھی بعض ہم موضوع تحریریں شامل کیں اور مناسب ترتیب کے ساتھ ایک رسالہ کی صورت میں اس کو تیار کیا۔ مولوی شمس الدین ندوہ کے تعلیم یافتہ ہیں اور اردو عربی کا اچھا مطالعہ رکھتے ہیں۔ مولینا سید ابوالحسن ندوی نے بھی ان کے اس ترجمہ کو جستہ جستہ سنا اور پسند فرمایا ہے اور انہی کی اجازت سے یہ رسالہ مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام کی طرف سے شائع کیا جا رہا ہے۔

محمد رابع ندوی
۲۵ مئی ۱۹۶۱ء

مجلسِ تحقیقات و نشریاتِ اسلام
دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

استشراق اور مستشرقین کا موضوع اپنی غیر معمولی اہمیت اور وسعت کے باوجود کسی وسیع علمی معیار پر ہمارے محققین کے زیر بحث نہیں رہا، گو کہ اس بات کی ضرورت روز بروز اہم ہوتی جا رہی ہے کہ علم الاستشراق کی تاریخ، کردار، مقاصد اور کھرے کھوٹے پر بے لاگ تنقید ہو، عوام کے سامنے اس کے کارنامے، تحقیقات و تالیفات کا صحیح تعارف ہو اور ساتھ ہی علمی لغزشیں اور مذہب پر اعتراضات کی غلط بوچھاڑ کا بھی پوسٹ مارٹم کیا جائے۔

اس موضوع پر دو چار کتابیں مصر کے بعض اہلِ قلم نے لکھیں لیکن ان میں بڑی حد تک استشراق نوازی اور اس سے شدید مرعوبیت کے آثار ملتے ہیں۔

ہمارے بہت سے اہلِ قلم مستشرقین پر غیر معمولی اعتماد، ان کی بے سوچے سمجھے تعریف و مدح سرائی اور ان کی تحقیقات کے آگے سر افگندہ ہو گئے۔ بلکہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین جیسے لوگوں نے اس کی دعوت و تبلیغ کے ساتھ اسلام کا صحیح مصدر (Sources) ہونے کا دعوے کر دیا جس کی وجہ سے ہمارے جدید فنکاروں پر اس کے بہت سے

خارجی اثرات رونما ہوئے ان کی تحریریں اس زہر سے خالی نہ رہ سکیں اب اگلی نسل کی باری ہے جن کے لیے انہی کی تحریریں معیار تحقیق بن سکتی ہیں۔

ہمارے جدید اسلامی مفکرین اور صاحب قلم لوگوں میں ڈاکٹر مصطفےٰ سباعی مرحوم تحقیق و مطالعہ کے میدان میں ایک خاص اسلوب کے مالک ہیں۔ ان کی شخصیت میں میرے لیے سب سے زیادہ پرکشش چیز ان کے مقدس جذبات، پاکیزہ دعوتی خیالات اور خلوص و للّٰہیت ہے جو ان کی تحریروں کا خاص جزو ہے۔

زیر نظر رسالہ انہی کی کتاب "المستشرقون والاسلام" کا معنوی ترجمہ ہے جو در اصل ان کی کتاب "السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی" کا خلاصہ ہے۔

بعض جگہ ان کی تحریروں میں مستشرقین کے بارے میں زیادہ تشدد دکھائی دیتا ہے جو ممکن ہے ان کی حمیت دینی کا تقاضا ہو لیکن یہ بات قابل اطمینان ہے کہ ان کی معلومات ہمارے لیئے زیادہ قابل اعتماد ہیں اور ان کے تجربے قیاسی نہیں عملی ہیں۔ موصوف کو مستشرقین کے جدید طبقہ سے خاصا تعارف حاصل رہا ہے اور مختلف اوقات میں ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں۔

ترجمہ لفظی سے زیادہ معنوی ہے لیکن اسلوب کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔ ترجمہ مختلف رسائل میں شائع ہوا اور اب رسالہ کی

شکل میں ہدیۂ ناظرین ہے۔

مستشرقین کے تعارف اور اسماء کی ترتیب میں کچھ دوسری کتابوں سے مدد لے کر اضافہ بھی کر دیا گیا ہے اور آخر میں تعارف کے لیے مرحوم کی زندگی کا مختصر حال بھی شامل ہے۔

خدا کرے! یہ حقیر سی کوشش بارگاہِ عالی میں قبول ہو کر باعثِ ثواب ہو۔ مترجم اس سلسلہ میں خاص طور پر مشفق گرامی مولانا محمد رابع حسنی سیکریٹری مجلس کا شکر گزار ہے۔

خود عاجو
سلمان شمسی ندوی
دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
یکم جون ۱۹۷۰ء

ضمیمۃ الکتاب
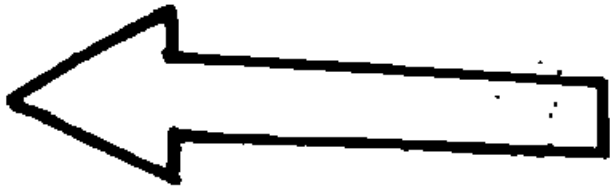
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے

مغربی مستشرقین کے فکر و فلسفہ کا اثر

موجودہ عالم اسلام کے رہنما و حکمراں طبقہ کے (جس نے عام طور پر لے علاے مغربی تعلیم گاہوں میں تعلیم پائی ہے یا مغربی زبانوں میں اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے) دماغوں میں اسلام کے ماضی کی طرف سے بدگمانی، اس کے حال کی طرف سے بے زاری، اس کے مستقبل کی طرف سے مایوسی، اسلام و پیغمبر اسلام اور اسلامی ماخذ (Sources) کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے اور "اصلاح مذہب" "اصلاح قانون اسلامی" کے طرز پر آمادہ کرنے میں (جس کا نمونہ کتاب میں شامل ہے) بہت بڑا حصہ ان علماء مغرب کا ہے جنھوں نے اسلامیات کے مطالعہ کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں اور ان کو عام طور پر مستشرقین (Orientlist) کہا جاتا ہے اور جو اپنے علمی تبحر، تحقیقی انہماک اور مشرقیات سے گہری واقفیت کی بنا پر مغرب و مشرق کے علمی و سیاسی حلقوں میں بڑی عظمت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور ان مشرقی اسلامی مباحث و مسائل میں ان کی تحقیق و نظریات کو حرف آخر اور قول فیصل سمجھا جاتا ہے۔

اس استشراق کی تاریخ بہت پرانی ہے جو واضح طور پر تیرھویں صدی مسیحی سے شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے محرکات دینی بھی تھے، سیاسی بھی

اقتصادی بھی۔ دینی محرک واضح ہے کہ اس کا بڑا مقصد مذہب عیسوی کی اشاعت و تبلیغ اور اسلام کی ایسی تصویر پیش کرنا ہے کہ مسیحیت کی برتری اور ترجیح خود بخود ثابت ہو اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب اور نئی نسل کے لیے مسیحیت میں کشش پیدا ہو۔ چنانچہ اکثر استشراق اور تبلیغ مسیحیت ساتھ ساتھ چلتے ہیں مستشرقین کی بڑی تعداد اصلاً پادری ہے۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد نسلاً و مذہباً یہودی ہے۔

سیاسی محرک یہ ہے کہ مستشرقین عام طور پر مشرق میں مغربی حکومتوں اور اقتدار کا ہراول دستہ (Pioneere) رہے ہیں۔ مغربی حکومتوں کو علمی کمک اور رسد پہنچانا ان کا کام ہے۔ وہ ان مشرقی اقوام و ممالک کے رسم و رواج، طبیعت و مزاج، طریق ماند بود اور زبان و ادب، بلکہ جذبات و نفسیات کے متعلق صحیح اور تفصیلی معلومات بہم پہنچاتے ہیں تاکہ ان پر اہل مغرب کو حکومت کرنا آسان ہو۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان حالات و تحریکات، عقائد و خیالات کا توڑ کرتے رہتے ہیں، جو ان حکومتوں کے لیے پریشانی اور دردِ سر کا باعث ہیں اور ایسی ذہنی اور علمی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن میں ان حکومتوں کی مخالفت کا خیال ہی پیدا نہ ہونے پائے۔ اس کے بالمقابل ان کی تہذیب کی عظمت اور ان کی خدمات کی وقعت پیدا ہو اور اپنے ملک کی اصلاح و ترقی اور ان کو مغرب کے نقش قدم پر چلنے کا ایسا جذبہ پیدا ہو کہ ان مغربی حکومتوں کے ہٹ جانے پر بھی ان کا ذہنی اور تہذیبی اقتدار قائم رہے۔

اسی بناء پر مغربی حکومتوں نے مستشرقین کی اہمیت و افادیت کو پوری طرح محسوس کیا اور ان کے سربراہوں نے ان کی پوری سرپرستی کی اور اسی مقصد کے ماتحت مختلف ممالک کے مستشرقین عالم اسلام کے مسائل سے متعلق مختلف رسائل و مجلات شائع کرتے ہیں جن میں عالم اسلام کے مسائل و رجحانات پر مبصرانہ تبصرہ اور ماہرانہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس وقت بھی رسالہ "شرق اوسط" اور مجلہ "عالم اسلامی" امریکہ سے اور فرانس سے نکل رہے ہیں۔

ان اہم مذہبی و سیاسی محرکات کے علاوہ قدرتی طور پر استشراق کا ایک محرک اقتصادی بھی ہے، بہت سے فضلاء اس کو ایک کامیاب پیشہ کے طور پر اختیار کرتے ہیں۔ بہت سے ناشرین اس بناء پر کہ ان کتابوں کی جو مشرقیات اور اسلامیات پر لکھی جاتی ہیں۔ یورپ اور ایشیا میں بڑی منڈی ہے، اس کام کی ہمت افزائی اور سرپرستی کرتے ہیں، اور بڑی سرعت کے ساتھ یورپ و امریکہ میں ان موضوعات پر کتابیں شائع ہوتی ہیں جو بہت بڑی مالی منفعت اور کاروبار کی ترقی کا ذریعہ ہے۔

ان مقاصد کے علاوہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض فضلاء مشرقیات و اسلامیات کو اپنے علمی ذوق و شغف کے ماتحت بھی اختیار کرتے ہیں اور اس کے لیے دیدہ ریزی، دماغ سوزی اور جانکشی سے کام لیتے ہیں جس کی داد نہ دینا ایک اخلاقی کوتاہی اور علمی ناانصافی ہے۔

ان کی مساعی سے بہت سے مشرقی و اسلامی علمی جواہرات و نوادر پردۂ خفا سے نکل کر منظرِ عام پر آگئے اور جاہل وارثوں اور ظالم لٹیروں کی دست برد سے محفوظ ہو گئے۔ متعدد اہم اسلامی مآخذ اور تاریخی وثائق ہیں جو ان کی محنت و ہمت سے پہلی مرتبہ شائع ہوئے اور مشرق کے اہلِ علم نے اپنی آنکھوں کو ان سے روشن کیا۔

اس علمی اعتراف کے باوجود اس کے کہنے میں باک نہیں کہ مستشرقین عمومی طور پر اہلِ علم کا وہ بدقسمت اور بے توفیق گروہ ہے جس نے قرآن و حدیث، سیرتِ نبوی، فقہ اسلامی اور اخلاق و تصوف کے سمندر میں بار بار غوطے لگائے اور بالکل خشک دامن اور تہی دست واپس آیا بلکہ اس سے اس کا عناد، اسلام سے دوری اور حق کے انکار کا جذبہ اور بڑھ گیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ نتائج ہمیشہ مقاصد کے تابع ہوتے ہیں۔ عام طور پر ان مستشرقین کا مقصد کمزوریاں کا تلاش کرنا اور دینی یا سیاسی مقاصد کے ماتحت ان کو نمایاں کرنا اور چمکانا ہوتا ہے، چنانچہ صفائی کے انسپکٹر کی طرح ان کو ایک گلزار و جنت نشاں شہر میں صرف غیر صحت مند مقامات ہی نظر آتے ہیں۔

مستشرقین کی محرومی صرف ان کی ذات تک محدود نہیں، اگر تنہا یہ پہلو ہوتا تو وہ ہماری توجہ کا مرکز اور ہماری اس بحث کا موضوع نہ ہوتا مسکہ کا سکیں اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو معقول و غیر معقول طریقہ پر ان کمزوریوں کی نشاندہی اور ان کو نہایت

معیب شکل میں پیش کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ وہ خوردبین سے دیکھتے ہیں اور اپنے قارئین کو دوربین سے دکھاتے ہیں۔ رائی کا پربت بنانا ان کا ادنیٰ کام ہے۔ وہ اپنے کام میں (یعنی اسلام کی تاریک تصویر پیش کرنے میں) اس سبک دستی، ہنرمندی اور صبر و سکون سے کام لیتے ہیں جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ وہ پہلے ایک مقصد تجویز کرتے ہیں اور ایک بات طے کر لیتے ہیں کہ اس کو ثابت کرنا ہے پھر اس مقصد کے لیے ہر طرح کے رطب و یابس، مذہب و تاریخ، ادب، افسانہ، شاعری، مستند و غیر مستند ذخیرہ سے مواد فراہم کرتے ہیں اور جس سے ذرا بھی ان کی مطلب برآری ہوتی ہو (خواہ وہ صحت و اسناد کے اعتبار سے کتنی ہی مجروح و مشکوک اور بے قیمت ہو) اس کو بڑے آب و تاب سے پیش کرتے ہیں اور اس متفرق مواد سے ایک نظریہ کا پورا ڈھانچہ تیار کر لیتے ہیں جس کا اجتماعی وجود صرف ان کے ذہن میں ہوتا ہے۔ وہ اکثر ایک برائی بیان کرتے ہیں اور اس کو دماغوں میں بٹھانے کے لیے بڑی فیاضی کے ساتھ اپنے ممدوح کی دس خوبیاں بیان کرتے ہیں تاکہ پڑھنے والے کا ذہن ان کے انصاف، وسعتِ قلب اور بے تعصبی سے مرعوب ہو کر اس ایک برائی کو (جو تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیتی ہے) قبول کر لے۔ وہ کسی شخصیت یا دعوت کا ماحول، تاریخی پس منظر، قدرتی و طبعی عوامل و محرکات کا نقشہ ایسی خوبصورتی اور عالمانہ انداز سے کھینچتے ہیں (خواہ وہ محض خیالی ہو) کہ ذہن اس کو قبول کرتا چلا جاتا ہے اور

اس کے نتیجہ میں وہ اس شخصیت و دعوت کو اس ماحول کا قدرتی ردعمل یا اس کا فطری نتیجہ سمجھنے لگتا ہے اور اس کی عظمت و تقدیس اور کسی غیر فانی سرچشمہ سے اس کے اتصال و تعلق کا منکر بن جاتا ہے۔ اکثر مستشرقین اپنی تحریروں میں "زہر" کی ایک مناسب مقدار رکھتے ہیں اور اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ وہ تناسب سے بڑھنے نہ پائے اور پڑھنے والے کو متنفر و بدگمان نہ کر دے۔ ان کی تحریریں زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہیں اور ایک متوسط آدمی کا ان کی زد سے نکل کر بچ جانا مشکل ہے۔

قرآن، سیرت نبوی، فقہ و کلام، صحابہ کرام، تابعین، ائمہ مجتہدین محدثین و فقہا، مشائخ و صوفیہ، رواۃ حدیث، فن جرح و تعدیل، اسماء الرجال حدیث کی حجیت، تدوین حدیث، فقہ اسلامی کے ماخذ، فقہ اسلامی کا ارتقاء۔ ان میں سے ہر موضوع کے متعلق مستشرقین کی کتابوں و تحقیقات میں اتنا تشکیکی مواد پایا جاتا ہے جو ایک ایسے ذہین و حساس آدمی کو جو اس موضوع پر وسیع اور گہری نظر نہ رکھتا ہو، پورے اسلام سے منحرف کر دینے کے لیے کافی ہے، اس کا علمی جائزہ لینا، ان کی تحریفات، ان کی غلطیوں اور ان کے دجل و تلبیس کو واضح کرنا اس وقت ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہے، یہ ایک اہم علمی موضوع اور عظیم الشان دینی خدمت ہے جس کے لئے ایک عظیم و منظم ادارہ کی ضرورت ہے۔

یہاں ہم نہایت اختصار کے ساتھ ان کی اس دعوت و تلقین کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جو انہوں نے پڑھے لکھے حوصلہ مند اور ترقی پسند نوجوان

قارئین کے سامنے بار بار اور مختلف عنوانوں سے پیش کرتے رہتے ہیں اور جس کو ان نوجوانوں کا ذہن ایک معقول اور بدیہی حقیقت کی طرح قبول کرتا چلا جاتا ہے۔ اس دعوت و تلقین کا اسلامی ممالک کی اصلاح و ترقی کی تحریکات سے قریبی تعلق ہے اور ان کی نوعیت کا اندازہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس موقع پر ہم اس خلاصہ کو بطورِ اقتباس پیش کرتے ہیں جو ایک مصری فاضل ڈاکٹر محمد البہی نے اپنی فاضلانہ کتاب "الفکر الاسلامی الحدیث" میں پیش کیا ہے اور جو اکثر و بیشتر مستشرقین کی کتابوں کا قدرِ مشترک اور ان کے خیالات کا عکس ہے۔

"اسلامی معاشرہ کی وابستگی اسلام کے ساتھ صرف ایک مختصر وقفہ میں مستحکم رہی، یہ وہ تاریخی وقفہ ہے جب کہ اسلامی معاشرہ ابتدائی حالت اور دورِ طفولیت میں تھا، اس ابتدائی حالت اور دورِ طفولیت نے اس کا موقع نہ دیا کہ زندگی اور اسلامی تعلیمات میں مناسبت اور ہم آہنگی پیدا ہو سکے لیکن اس مختصر ابتدائی وقفہ کے ختم ہوتے ہی اسلامی معاشرہ اور اسلام کے درمیان خلیج پڑ گئی اور اسلام زندگی کی رہنمائی کا سرچشمہ نہیں رہا۔ کلچرل، سیاسی، اقتصادی اور دوسرے خارجی محرکات و عوامل کے نتیجہ میں اسلامی معاشرے کے اندر زندگی جتنی تبدیل ہوتی رہی اور ترقی کرتی رہی اتنا ہی اسلام اس بدلتی ہوئی اور ترقی کرتی ہوئی زندگی کا ساتھ

دینے سے قاصر ہوتا چلا گیا۔ یہ خلیج بڑھتی ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ خلافتِ اسلامی کے آخری مرکز (جدید ترکی) نے اس کا اعلان کر دیا کہ اسلام اب عام زندگی میں دخل نہ دے سکے گا اور اب اس کی جگہ فرد کے ضمیر میں ہوگی اور یہ فرد بغیر کسی اعلان اور جوش کے اپنی ذات کے لیے اس کا اظہار کر سکے گا۔

اسلامی تعلیمات کا نافذ نہ کر سکنا اجتماعی ضرورت کا عین تقاضا ہے اور یہ نتیجہ ہے روز بروز بدلتی ہوئی زندگی کے ان حالات کا جنکو اسلام اپنی تعلیمات کی روشنی میں اپنے مطابق نہیں بنا سکا۔ اور ان کے اور اپنی تعلیمات کے درمیان ہم آہنگی پیدا نہ کر سکا۔ اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے پر زور دینے کے معنی اس زمانہ میں اس کے سوا کچھ اور نہیں ہیں کہ زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے۔ تمدنِ جدید کے وسائل سے فائدہ اٹھانے میں مسلمان دنیا سے پیچھے رہ جائیں۔ مسلمان ممالک میں غربت، بیماری اور جہالت کو بخوشی گوارا کیا جائے جیسا کہ اس وقت سعودی حکومت میں حال ہے۔ یہ وہ تنہا اسلامی ملک ہے جس نے سرکاری طور پر اسلام پر عمل کیا ہے۔ اس لیے وہ اس بات پر نمونہ ہے کہ اسلام پر عمل کرنے سے کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

تغیر و ترقی جو زندگی کا ایسا عام قانون ہے جس سے

مغرنہیں مسلمانوں کو اپنے اسلام کے بارے میں بھی اس سے
کام لینا چاہیئے تاکہ وہ جدید مغربی دنیا کے قدم بہ قدم چل سکیں
اور کمزوری و بدنظمی کے اسباب سے نجات پاسکیں۔ اس کے
لیے ضروری ہے کہ وہ خود اسلام پر بھی بحیثیت ایک مذہب
کے اس قانون کو نافذ کریں اور اس کو زمانہ کے ساتھ بدلنے
اور ترقی دینے کی کوشش کریں۔ ملتِ اسلامی کو بھی تغیر و ترقی
کے اس فطری اور ابدی قانون کی پیروی میں مغربی معیار
(Idea) کے مطابق چلنا اور اپنے مشرقی ماحول میں اس
سے متاثر ہونا ضروری ہے اس لیے کہ فکر و زندگی کے
میدان میں اہلِ مغرب کے رجحانات طویل انسانی تجربوں کا
نتیجہ ہیں۔ اہلِ مغرب نے ان رجحانات کی تشکیل میں علمی اور
سائنٹیفک طریقہ استعمال کیا۔ یہ طریقہ اوہام و خرافات
اور مخصوص عقائد سے متاثر نہیں ہوتا۔ اس کے پیشِ نظر صرف
انسانیت کی فلاح ہوتی ہے ؂

تقریباً ڈیڑھ دو صدی کے طویل و مسلسل تجربہ کے بعد مستشرقین نے
محسوس کیا کہ ان کے طریقِ کار میں بنیادی غلطی تھی جس کی وجہ سے ان
کی جدوجہد کا پورا نتیجہ نہیں نکل رہا تھا اور بعض اوقات اس کے خلاف
اسلامی حلقوں میں شدید ردِعمل اور اشتعال پیدا ہو جاتا تھا جو تبلیغی و دعوتی

نقطۂ نظر سے خطرناک تھا، وہ برابر اپنی مساعی اور ان کے اثرات و نتائج کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے رہے۔ اب ان نتائج کی روشنی میں انھوں نے طے کیا کہ ان کو اپنا رویہ اور طریق کار میں بنیادی تبدیلی کرنی چاہیئے اور بجائے مسلمانوں کو بدلنے کی کوشش کے اسلام کے جدید تعبیر پیش کرنے اور اصلاح مذہب (Reform) کی تحریک چلانی چاہیئے اور اس ذہنی تبدیلی اور ایک نئے طریق کار کی حسب ذیل اقتباس سے بخوبی نشان دہی ہوتی ہے۔ Harry gaylord Darmon (Towards under loslahiny Isl:) میں لکھتا ہے

> اصلاحی تحریکیں، دینی تعلیمات کی موجودہ تجربوں کی روشنی میں از سر نو تشریح کرنے کی مخلصانہ کوششیں ہوتی ہیں۔ یا ان کے ذریعے نئے تجربوں کو دینی تعلیمات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے اس لئے وہ مسیحیت کے ایک مبلغ کے لیے اولین اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ ہر نئی تحریک جس کو کہ چند خبطی شروع کر دیں وہ اس کا استحقاق رکھتی ہے کہ اس کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔ ہماری مراد ان تحریکوں سے ہے جن کی حیثیت موجودہ زندگی کے سچے دینی اظہار کی ہے۔ اور جو روزمرہ کے تجربہ کی روحانی تشریح کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور پھیلتی جارہی ہے اور جس میں روحانی قوتیں

حقائق سے نبرد آزما ہیں۔

بہت ممکن ہے کہ ان میں سے ایک اصلاحی تحریک مسلمانوں کے حضرت عیسیٰؑ کو سمجھنے کے سلسلے میں بالآخر بڑی اہم ثابت ہو حتیٰ کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آئندہ چند سالوں میں اسلامی ممالک میں (مسیحی) مبلغ کا اصل کارنامہ مسلمان افراد کی اصلاح واحیاء سے زیادہ اسلام کی تجدید واحیاء کا ہو۔ عمل یہ کام کا ایک میدان ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اور جس سے غفلت نہیں برتی جا سکتی۔ میدان کھلا ہوا ہے یہ ان معذرت پسندوں کی مثال سے ظاہر ہے جو عیسائیوں اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا خیر مقدم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔"

اس نصف صدی کے اندر عالم اسلام میں اصلاح و ترقی (در حقیقت تجدد و مغربیت) کے جتنے علم بردار پیدا ہوگئے ان کے خیالات، اعلانات اور ان کے طریق کار میں مستشرقین کی اسی دعوت و تلقین کا عکس صاف نظر آئے گا یہاں تک کہ مستشرقین کے ان خیالات کو ان مصلحین و زعماء کے فکر و عمل کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے اور ان کو ان کا مشترک منشور (Manifesto) کہا جا سکتا ہے۔

ان مستشرقین نے ایک طرف اسلام کے دینی افکار و اقدار کی تحقیر کا کام کیا اور مسیحی مغرب کے افکار و اقدار کی عظمت ثابت کی اور اسلامی

تعلیمات واصول کی ایسی تشریح پیش کی کہ اس سے اسلامی اقدار کی کمزوری ثابت ہو اور ایک تعلیم یافتہ مسلمان کا رابطہ اسلام سے کمزور پڑ جائے ، اور وہ اسلام کے بارے میں متشکک ہو جائے یا کم از کم یہ سمجھنے پر مجبور ہو کہ اسلام موجودہ زندگی کے مزاج کے ساتھ نہیں چل سکتا اور اس زمانہ کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے سے عاجز ہے۔ ایک طرف انھوں نے بدلتی ہوئی زندگی اور تغیر پذیر اور ترقی یافتہ زمانہ کا نام لے کر خدا کے آخری اور ابدی دین اور قانون پر عمل کرنے کی روایت پرستی ، رجعت پسندی اور قدامت و دقیانوسیت کا مرادف قرار دیا اور دوسری طرف اسی کے بالکل برعکس انھوں نے ان قدیم ترین تہذیبوں اور زبانوں کے احیاء کی دعوت دی جو اپنی زندگی کی صلاحیت اور ہر طرح کی افادیت کھو کر ماضی کے ملبہ کے نیچے سیکڑوں ، ہزاروں برس سے مدفون ہیں اور جن کے احیاء کا مقصد مسلم معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے ، اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کرنے ، اسلامی تہذیب و عربی زبان کو نقصان پہنچانے اور جاہلیتِ قدیمہ کو زندہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ انہی کی تحریروں کے اثر اور انہی کے شاگردان رشید کے ذریعہ مصر میں "فرعونی" عراق میں "آشوری" شمالی افریقہ میں "بربری" فلسطین ولبنان کے ساحل پر تہذیب و زبان کی احیاء کی تحریکیں شروع ہوئیں اور ان کے مستقل داعی پیدا ہو گئے اور انہی مستشرقین اور ان کے شاگردوں نے شدومد کے ساتھ یہ کہنا شروع کر دیا کہ قرآن کی

عربی زبان "فصحیٰ" اس زمانہ کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی۔ اس کے بجائے عوامی (Colloquial) اور مقامی زبانوں کو رواج دینا چاہئے اور انہی کو اخبارات اور کتابوں کی زبان بنانا چاہئے اور یہ بات انہوں نے اپنی خوبصورتی سے اور اتنے بار کہی کہ مصر میں اچھے پڑھے لکھے اور صاحب قلم لوگوں نے اس تحریک کی حمایت شروع کر دی جس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ ہر ملک اور ہر صوبہ کی الگ الگ زبان ہو جائے۔ قرآن مجید اور اسلامی ادب سے عرب قوموں کا رشتہ کٹ جائے اور وہ ان کے لیئے اجنبی بن جائے۔ عربی زبان اپنی بین الاقوامی حیثیت ختم کر دے اور عرب اس پورے دینی سرمائے اور روح سے محروم ہو کر الحاد و ارتداد اور اختلاف و انتشار کی نذر ہو جائیں۔

اس طرح انھوں نے عربی رسم الخط کے بجائے لاطینی رسم الخط (Roman Charactor) کے اختیار کرنے کی دعوت دی اور ان کے تلامذہ نے وقتاً فوقتاً اس کی ضرورت ثابت کی اور اس کے فوائد و فضائل بڑی بلند آہنگی سے بیان کیے۔ اس کا نتیجہ بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ پوری عرب قوم صحیح طور پر قرآن پڑھنے سے محروم و ناآشنا ہو جائے اور وہ پورا علمی ذخیرہ (جو اپنی وسعت اور علمی قیمت میں بے نظیر ہے) بے معنی اور بیکار ہو کر رہ جائے۔

ان تجاویز اور مشوروں سے مستشرقین کے حقیقی مقاصد و خیالات ان کی دور بینی اور ان کی اسلام دشمنی کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان میں

سے اکثر کی تصنیفات اسلام کی بنیادوں پر تیشہ چلاتی ہیں۔ اسلامیات کے سرچشموں (بشمول حدیث و فقہ) کو مشکوک قرار دیتی ہیں۔ مسلم معاشرہ میں سخت ذہنی انتشار اور تشکک و ارتیاب پیدا کرتی ہیں۔ اسلام کے حاملین و شارحین (محدثین و فقہاء) کی علمیت و ذہانت کی طرف سے مشکک بناتی ہیں۔ فاحش علمی غلطیوں، مضحکہ خیز غلط فہمیوں، زبان و قواعد سے ناواقفیت اور بعض اوقات کھلی تحریفات کی ان میں بکثرت مثالیں ملتی ہیں لیکن ان کی اکثر و بیشتر تصنیفات مغربی و مشرقی دنیا میں مقبول ہیں۔ نیا تعلیم یافتہ طبقہ (جس میں سن رسیدہ اہل علم بھی ایک خاص تعداد میں شامل ہیں) اس کی حسن ترتیب، طرز استدلال، نتائج کے استنباط اور پیش کرنے کے علمی (سائنٹفک) طریقہ سے مرعوب ہے، اور اس کی تشفی خالص علمائے مشرق کی تصنیفات سے نہیں ہوتی، مغربی علمائے مشرقیات جس وقعت و اعتماد کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور انھوں نے مشرق میں جو مقام حاصل کر لیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مشرق وسطیٰ کی تینوں موقر مجالس علمیہ (Academy) المجمع اللغوی (مصر) المجمع العلمی العربی (شام) المجمع اللغوی العراقی (بغداد) میں مستشرقین کی ایک خاص تعداد رکن ہے اور ان کے مطالعہ و آراء سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ عالم اسلام اور عالم عربی کی بے مائیگی اور کم ہمتی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خالص اسلامی و عربی موضوعات پر عرصہ دراز سے مستشرقین ہی کی کتابوں پر دار و مدار

ہے اور وہ اپنے موضوع پر ایک طرح سے کتاب مقدس (Gospal)
کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاریخ، ادبیات عربی پر نکلسن (A. Nicholson).
کی کتاب (History of Arabs) تاریخ ادبیات اسلامیہ
پر بروکلان کی کتاب (Gesehichtir Arabischen
Literature) جرمنی میں اور اس کا عربی ترجمہ
اسلامی قانون پر شاخت (The history of Arab's literature)
کی (The Origins of Mohammadons
jurisprudance) اپنے اپنے موضوع پر منفرد سمجھی جاتی ہیں
اور بیشتر مشرقی جامعات میں شعبہ عربی اور اسلامیات میں ان کی
حیثیت ایک علمی مرجع (Reference Book) اور سند
(Authority) کی ہے۔ مستشرقین کا مرتب کیا ہوا دائرۃ
المعارف الاسلامیہ (Encyclopaedia of Islam)
جس کے متعدد ایڈیشن یورپ اور امریکہ سے نکل چکے ہیں اور جن میں
برائے نام مسلمان مقالہ نگاروں کی ایک جماعت بھی شامل ہے۔ اسلامی
معلومات وحقائق کا سب سے بڑا اور مستند ذخیرہ سمجھا جاتا ہے
اور مصر و پاکستان میں اسی کو بنیاد بنا کر عربی اور اردو میں منتقل کیا
جا رہا ہے۔

اس صورتِ حال کی اصلاح اور مستشرقین کی تخریبی اور تشکیکی اثرات
کو روکنے کی صورت صرف یہی ہے کہ ان علمی موضوعات پر مسلمان

محققین اور اہلِ نظر قلم اٹھائیں اور مستشرقین کی ان تمام قابلِ تعریف
خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بلکہ ان کو ترقی دیتے ہوئے جو ان کا حصہ
سمجھی جاتی ہیں، مستند وصحت مند اسلامی معلومات اور نقطۂ نظر پیش کریں یا
ایسی تصنیفات ہوں جو اپنی تحقیقات کی اصلیت (ORIGINALITY)
مطالعہ کی وسعت، نظر کی گہرائی اور عمیق ماخذ کے استناد وصحت
اور اپنے محکم استدلال میں مستشرقین کی کتابوں سے کہیں فائق و
ممتاز ہوں اور ان میں ان کی تمام خوبیاں ہوں اور ان کی کمزوریوں
اور عیوب سے پاک ہو۔ دوسری طرف ان مستشرقین کا علمی محاسبہ
کیا جائے اور ان کی تلبیسات کو بے نقاب کیا جائے، متن سمجھنے میں
ان کی غلط فہمیوں اور ترجمہ و اخذ مطلب میں ان کی غلط فہمیوں کو
واضح کیا جائے۔ ان کے مآخذ کی کمزوری اور ان کے اخذ کئے ہوئے
نتائج کی غلطی کو روشن کیا جائے۔ اور ان کی دعوت وتلقین میں جو بدنیتی،
مذہبی اور سیاسی مقاصد شامل ہیں، ان کو طشت از بام کیا جائے
اور بتایا جائے کہ یہ اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے خلاف کیسی گہری
اور خطرناک سازش ہے۔

اس سے پہلے مثبت وایجابی کام (اسلامی موضوعات پر تصنیف) اور
اس دوسرے سلبی وجوابی جزو (علمی محاسبہ) کے بغیر دنیائے اسلام کا ذہین
وحوصلہ مند طبقہ جو یورپ وامریکہ کی بلند پایہ یونیورسٹیوں یا اپنے ملک کی
اعلیٰ تعلیم گاہوں میں تعلیم پاتا ہے اور مغربی زبانوں ہی میں (جن میں

وہ زیادہ مہارت رکھتا ہے) اور اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے مستشرقین کے زہرآلود خیالات کے اثر سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ اور جب تک اس اثر سے آزاد نہ ہو اسلامی ممالک برابر فکری انتشار و ذہنی ارتداد کے خطرے سے دوچار رہیں گے۔ ان کے ممالک میں تجدد و مغربیت کے علمبردار برابر ان خیالات کا اظہار کرتے رہیں گے اور جب اقتدار ان کے ہاتھ میں آئے گا تو ان کو بروئے کار لانے کی کوشش کریں گے جو اسلام کی روح کے منافی ہیں، اور ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کرتے ہیں جو صرف نسل و قومیت میں قدیم اسلامی معاشرہ سے مشابہت رکھتا ہے اور جس کا رخ مغرب اور خالص مادیت کی طرف ہوگا اور جس کو دیکھ کر کم سے کم عالم اسلام کے ان فضلاء اور رہنماؤں سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ؎

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی — کیں رہ کہ تو میروی بترکستان است

تاریخی پس منظر

یقینی طور پر یہ معلوم ہونا بہت زیادہ دشوار ہے کہ علوم مشرقیہ کو مغرب میں کس نے کس وقت سب سے پہلے اپنا مرکز توجہ بنایا، لیکن بڑی حد تک یہ سلسلہ یورپین راہبوں کے ہاتھوں شروع ہوا جنھوں نے اندلس کے عظیم گہوارۂ علم میں پناہ لی۔ وہیں کی درسگاہوں میں علمی نشو ونما پائی اور پھر ان کے قلم سے قرآن مجید اور دوسری عربی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔

انھوں نے مسلمان علمار کی مجلسوں میں رہ کر مختلف علوم پر عبور حاصل کیا اور خاص طور پر فلسفہ، طب اور ریاضیات میں مہارت پیدا کی۔ راہب عالموں کی فہرست میں ہمیں سب سے پہلے مشہور فرانسیسی راہب جیربرٹ (Jerbert) کا نام ملتا ہے جو اندلس سے واپسی کے بعد ۹۹۹ء میں روم کے کلیسا کا پادری مقرر ہوا۔ اسی طرح پطرس (Furrde) ۱۰۹۲ء تا ۱۱۵۶ء جیرارا ڈ ڈی کریمون (G.R.Rmonde) ۱۱۱۴ء تا ۱۱۸۷ء کے بعد یہ سلسلہ اپنی اصلی

میں ظاہر ہوا اور ان لوگوں نے اپنے اپنے وطن میں عربوں کی تہذیب و ثقافت کی اشاعت کی۔ ان کی مشہور علمی تصانیف سے استفادہ کیا اور انھیں عام کرنے کی جد وجہد کی۔ عربی تعلیم کے لئے بہت سے تعلیمی ادارے کھولے گئے جس میں مثال کے طور پر "بادوی" کے مدرسے کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

ان اداروں اور مدرسوں میں باقاعدہ عربوں کی تصانیف کی تدریس ہونے لگی اور اسی ضمن میں بہت سی عربی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا جو اس وقت علمی دنیا میں عالمی زبان شمار کی جاتی تھی۔

یہ ادارے اور مدرسے مغرب کی جامعات اور یونیورسٹیوں میں تبدیل ہوئے اور انھوں نے اپنے نصاب تعلیم کی بنیاد عربوں کی تصانیف کو بنایا اور تقریباً چھ صدیوں تک اسے اپنے علم کا ماخذ سمجھتے رہے۔

یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ یورپین نسل میں کچھ ایسے لوگ ہمیشہ پیدا ہوتے رہے جنھیں اسلام اور عربی سے گہری دلچسپی تھی۔ یہ لوگ مختلف عربی کتابوں کا ترجمہ کرتے رہے۔ ۱۸ ویں صدی میں زمانے نے کروٹ بدلی اور مغرب کے سامراجی نظام نے عالم اسلام پر یلغار کی۔ عربوں کی حکومتیں مغرب کے زیر نگیں ہوئیں۔ اس وقت مغربی ماہرین نے علم و استشراق میں مزید دلچسپی لی اور مغربی ممالک میں اس کے لئے رسائل بھی جاری ہوئے۔

انھوں نے عربی مخطوطات کو اسلامی ملکوں میں رہ کر بدلنے کی

کوشش کی۔ یہ مخطوطات اور نادر نسخے عرب کے جاہل عوام سے خرید لیے جاتے یا سرقہ وغیرہ کی راہ سے حاصل کرتے، پھر انھیں اپنے ملک کے کتب خانوں میں منتقل کر دیا جاتا۔ اس طرح عربی کے قیمتی مخطوطات کے نادر نسخے بڑی تعداد میں یورپ کے کتب خانوں میں منتقل ہوئے۔ ۱۹ ویں صدی کے وسط تک پچاس ہزار دو سو جلدوں کا ذخیرہ یورپ کے میوزیم میں جمع ہو گیا جس میں مزید اضافہ ہنوز جاری ہے۔

۱۹ ویں صدی کے شروع چوتھائی حصہ ۱۸۱۲ء میں پہلی بار پیرس میں مستشرقین کی کانفرنس منعقد ہوئی اور پھر مختلف اوقات میں پے درپے ایسی مجلسوں کا انعقاد ہوتا رہا جس میں مشرقی مذاہب اور تہذیبوں کو مطالعہ تحقیق کا موضوع بنایا گیا۔ اور اب بھی ایسی کانفرنسوں کا انعقاد ہوتا رہتا ہے۔

اصل میدان

جیسا کہ ابھی کہا گیا کہ استشراق کی ابتدا عربی زبان اور اسلام کے سیکھنے سکھانے سے ہوئی لیکن شرق اوسط میں مغرب کی سامراجی یورش کے بعد استشراق کا میدان مزید وسیع ہوتا چلا گیا اور ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت مشرق کی تمام تر تہذیبوں، زبانوں، ادیان و مذاہب کا مطالعہ شروع ہوا جس میں مشرق کے رسم و رواج اور جغرافیائی حالات کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا لیکن ان سب میں عربی زبان و ادب اور اسلامی تحقیقات (Oriental Studies) کو خاص اہمیت دی گئی جس کا سبب شاید وہ مذہبی اور سیاسی جذبات تھے جنھوں نے مشرقی علوم پر ابھارا جس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔

ان یورپین مستشرقین کے بنیادی مقاصد (جو زیادہ تر مذہب کی آڑ میں ہیں) سمجھنے کے لئے کسی طویل بحث میں جانے کی ضرورت نہیں اور جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ اس کا سلسلہ پادریوں اور راہبوں سے شروع ہوا آج تک اسی ڈگر پر جاری ہے۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اسلام

کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بناکر مجروح کیا جائے۔ اس کی حسین و معصوم تصویر کو بگاڑا جائے۔ اس کے حقائق میں تحریف ہو، بھولے بھالے عوام ان کی دینی بندگی اور قیادت کے آگے سر ٹیک دیں۔ اسلام جو اس وقت مسیحیت و عیسائیت کا انتہائی دشمن ہے، وہ ایسا دین ہے جو نشر و اشاعت کا مستحق نہیں۔

اسلام کے نام لیوا خونریز ڈاکوؤں اور اچکوں کی ٹولی ہے جن کا دین انھیں جسمانی عیش کوشی پر آمادہ کرتا ہے اور کسی بھی روحانی بلندی سے دور اور بے تعلق ہے۔

موجودہ دور میں ان حملوں کی ضرورت ان کے نزدیک اور اہم ہو گئی جب کہ نئی تہذیب نے اہل مغرب میں عقیدے کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا اور اپنے مذہبی گروہ سے ملنے والی دینی غذائیں ان کے احساسات مشکوک اور شبہات کے طویل فاصلے طے کرنے لگیں۔

اس وقت ان کے لیے اس سے بہتر راستہ نہ تھا کہ وہ اسلام پر کیے جانے والے حملوں کو تیز کر دیں اور اس طرح مغربی عوام کی توجہ مقدس کتابوں اور تنقید و تبصرہ سے ہٹا کر اس طرف لگائی جائے کہ اسلام کی فتوحات صلیبی جنگوں اور فتوحات نے یورپ میں کیا نتائج پیدا کیے۔ تاکہ اسے دیکھ کر قوم میں اسلام کی قوت سے خوف پیدا ہو اور اس کے ماننے والوں سے نفرت بھڑک اٹھے۔

انھوں نے اس نفسیاتی فضا سے فائدہ اٹھا کر اسلامی علوم میں

مزید دلچسپی لینا شروع کی۔ اس تشیری کا دوسرا بنیادی مقصد جسے کبھی بھی ان مستشرقین نے اپنی تحقیق میں فراموش نہیں کیا اور اپنے صاحب دین ہونے کی حیثیت سے برحق سمجھتے رہے ، یہ ہے کہ انھوں نے تہذیب پر دل وجان سے قربان ہونے والے سادہ لوح مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی ظاہری اور علمی کارناموں کو فتح کیا۔ ان کے اسلامی عقائد کو کھوکھلا کیا اور اسلام کے عظیم ورثہ علمی اور تہذیبی سرمایہ میں شکوک وشبہات کی آگ بھڑکادی ، انھوں نے اسلام سے متعلق ہر فن کو مجروح کیا ، اور مسلسل اسی کوشش میں مصروف ہیں ۔

صلیبی جنگوں کے ختم ہونے کے بعد صلیبیوں کی عظیم شکست کے باوجود بھی مغرب کے نونہال عرب علاقوں اور پھر اسلامی گہواروں کو دوبارہ تاخت وتاراج کر دینے سے مایوس نہ ہوئے ۔ یہ جنگیں بظاہر مذہبی تھیں لیکن اصلاً ان کا تعلق سامراجی نظام سے تھا۔ انھوں نے ان ملکوں کے علوم وفنون کا مطالعہ کرنا شروع کیا جن میں عقیدہ وعادات اور اخلاق سب ہی شامل تھے تاکہ ان کے وسائل وذرائع کو سمجھ کر انھیں کمزور کریں اور کمزور گوشوں کو ختم کریں ۔

فوج اور طاقت کے غلبہ کے بعد استشراق کے بھرم پر ہمارے اندر روحانی اور اندرونی خصوصیات کمزور پڑیں اور ہمارے نظریات وتصورات میں شک نظر آیا اور پھر خود اعتمادی کو ٹھیس پہنچی ۔ ہم نے اپنے آپ کو مغرب کے ہاتھوں میں دے دیا اور وہاں اپنی اخلاقی اور اعتقادی معیار کی

از سرِ نو تجدید کے لیے اپنے کو سپرد کیا جس سے ان کی امید بر آئی نئی نسل ان کی تہذیب و تمدن کے آگے اس طرح سرنگوں ہوئی گویا دوسری طاقت اسے کبھی نہیں اٹھا سکے گی۔

آپ دیکھیں کہ یہ لوگ ہمارے ملکوں میں اس پرانی قومیت کو جسے گردشِ زمانہ نے صدیوں پہلے نظروں سے اوجھل کر رکھا ہے۔ اس کو یہ کس طرح اہمیت دے کر زندہ کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اسلام سے پہلے عربوں کی "قومی کہانیوں" کی یاد دلاتے ہیں۔ ان کی زبان، عقیدہ اور ملک کی ایکتا کو ابھارتے ہیں تاکہ وہ اس پیغام کو ان کے سامنے دوبارہ پیش کریں۔ ان کے اور مختلف طبقوں کے درمیان انسانی تعلقات کے نام پر تاریخی اور تہذیبی رشتے قائم ہوں جس سے ان کی طاقت میں اضافہ ہو اور ان کے قبائل، گروہ، بلندی و سرفرازی میں آگے بڑھیں۔ نصف صدی گزر گئی مگر یہ لوگ مسلسل مصر میں فرعونیت، شام میں فنیقیت اور عراق میں اشوریت کو دوبارہ زندگی دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ تاکہ "اخوت و یکتا" کے نام پر گروہی طبقے جاگ اٹھیں۔ آزادی کی قوت سلب ہو اور ہماری ہی زمین پر ہماری قوت، آزادی اور سیاست اپنا دم توڑ دے اور عقیدہ اور تاریخ میں انتشار پیدا ہو۔

استشراق کی نشر و اشاعت میں تجارتی عوامل کو بھی بڑا دخل رہا۔ اہلِ مغرب نے ہمارے ساتھ تجارتی معاملات کا سلسلہ شروع کیا۔ ہمارے ملکوں نے ان کی مصنوعات کو قبول کیا اور انھوں نے ہمارے قدرتی خام

مل کی قیمتیں دینا شروع کیں جس کی وجہ سے مقامی صنعت وحرفت کے مراکز بھی ختم ہوئے اور ان کی جگہ مغرب کے فولادی کارخانے قائم ہونے لگے۔

اس کے سوا ایک بڑا سبب جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے انوکھا ہے اور ہمارے ملکوں کی آزادی کے بعد اسے حسین شکل میں ملنے کا موقع ملا۔ وہ یہ تھا کہ کسی سیاسی پالیسی کے نام پر تمام سفارتی مراکز میں کسی خاص سیکریٹری یا کلچرل اتاچی کا تقرر کیا جائے اور اس تقرر کے ساتھ یہ شرط لگا دی گئی کہ وہ عربی زبان کا ماہر ہو تاکہ اپنی علمی سند کی بنا پر اس ملک کے اہل قلم، صاحب فکر اور سیاسی عناصر سے اپنا رابطہ قائم کر کے اپنی سفارتی پالیسی کے تحت ان میں شورش وکشمکش کی تازہ روح اور نئی غذا فراہم کرتا ہے اور ہماری آنکھیں ان کے سنگین نتائج دیکھ چکی ہیں۔

بہت سے عربی ممالک میں یہ خطرناک کھیل کھیلا گیا جو ان میں آپس کی تفریق اور ملکی انتشار کا پیش خیمہ تھا۔ ان سفرا نے جن میں بہت سے اب بھی اپنی جگہوں پر فائز ہیں۔ عربی اور اسلامی "اصطلاح" میں فرق کر کے ان کے ملکی دوستانہ تعلقات کو ٹھیس پہنچائی۔ انھوں نے خیرسگالی کے معصوم جذبے کے تحت عرب ممالک کی طاقت کو منتشر کیا لیکن سب کچھ اس وقت ہوا جب انھوں نے اپنے ملک کے کرتا دھرتا لوگوں کو اپنا فلسفہ اچھی طرح سمجھا دیا اور ان پر ان کی عوامی سیاسی کمزوریوں کو واضح کر دیا جب کہ اس ملک کے رہنے والوں نے فرقہ وارانہ زخموں

کو سامراجی مصالح کی آڑ سے دیکھ لیا تھا۔

مستشرقین میں کچھ لوگ جن کی تعداد بہت کم ہے ایسے بھی ہوئے جنھوں نے عالمی قوموں کی تہذیب وتمدن سے واقفیت، ان کے ادیان اور مذاہب اور زبان وثقافت سے دلچسپی کی بناء پر انھیں موضوعات پر پڑھا اور قدم اٹھایا لیکن اس میں شک نہیں کہ انھوں نے دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ بلند ہمتی اور فراخ دلی سے کام لیا اور اسلام کو سمجھنے میں بہت کم لغزشوں کے مرتکب ہوئے جس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اپنا بنیادی مقصد تحریف وتبدیل کو نہیں بنایا تھا اس لئے ان کی علمی تحقیقات حقائق سے زیادہ قریب ہیں اور انہیں علمی سطح پر رکھا جاسکتا ہے۔ انھوں نے عام مستشرقین کے اسلوب کو نہیں اپنایا بلکہ ان میں بہت سے ایسے خوش نصیب بھی تھے جنھیں اپنے اس مطالعہ کی بدولت اسلام کا شرف نصیب ہوا اور انھوں نے اس کے پیغام کو سینے سے لگایا لیکن ایسے لوگ اس وقت ابھرے جب انھیں اس میں کسی مالی معاونت کا سہارا ملا اور اس کی بنا پر وہ معاش سے بے فکر ہو کر اپنی توجہ خلوص ودیانت کے ساتھ مشرقی علوم وتحقیقات (Oriental Studies) پر صرف کرنے لگے۔ مگر ظاہر ہے کہ ان کی ایسی بحثیں جو خواہشاتِ نفس سے خالی ہیں انھیں نہ اہل دین میں کوئی مقبولیت حاصل ہوتی ہے اور نہ سیاسی کارکنوں اور رہنماؤں میں اس کا کوئی وقار ہوسکتا ہے انھیں اس سے کسی منفعت کی امید تھی اس لیے مستشرقین کے علمی حلقوں میں یہ لوگ نادر الوجود بھی رہے اور اب بھی کمیاب ہیں۔

مقاصد و وسائل

مستشرقین کے مطالعاتی سلسلہ کو تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

انکار عقل کی روشنی میں

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغامِ ابدی کی صحت میں شکوک اور اس کے براہِ راست آسمانی پیغام ہونے میں شبہات پیدا کرنے کی مہم! بہت سے مستشرقین کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا نبی ہونا جس کا تعلق براہِ راست وحیٔ الٰہی سے ہو باعثِ انکار ہے۔ وحی کی ظاہری صورتیں جو اصحابِ رسولؐ اور خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دکھائی دیتی تھیں۔ ان کے لیے حیرانی کا باعث ہیں۔ اور پھر انھیں یہ ناقابلِ فہم فلسفہ پاگل بنا دیتا ہے۔ ان میں سے بعض اسے "مرگی" سمجھے جس کی نسبت کبھی کبھی حضورِ اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف کرتے رہے ہیں اور بعض اسے "تخیلات" سمجھے" جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن کو مشوش کیے ہوئے تھے۔ بعض نے اس کی تفسیر "نفسیاتی" مرض سے کی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا واقعہ ان کے لیے انبیاء کی تاریخ میں ایک انوکھا واقعہ تھا جن کو سمجھنے سے ان کی عقلیں قاصر ہیں۔ نہ ان سے پہلے کوئی رسول آیا تھا اور نہ ان لوگوں نے کسی نبی کے بارے میں سنا تھا جب کہ یہ تمام مؤرخین یہودیت یا مسیحیت ان دونوں مذاہب قدیمہ میں سے کسی ایک کے معترف ہی نہیں، پیرو ہیں اور موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام کی رسالت کو مانتے ہیں جو یقیناً مرتبہ کے لحاظ سے پیغمبر اسلام سے کم اور اپنی شریعت میں نامکمل اور اپنے اصولوں میں آپ کی آخری رسالت کے ضرورت مند تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد نبوت محمدی کا انکار کسی دینی تعصب اور عناد ہی کا نتیجہ ہے جس کی روح ان کے علمائے رہبران اور مبشرین میں موجود ہے۔ اس کے ساتھ وہ اس کے بھی منکر ہیں کہ قرآن مجید حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی منزل من اللہ کتاب ہو سکتی ہے۔

اور جب قرآن کے خصائص اور اس کی تاریخی دستاویزات اور گزری ہوئی سچی کہانیاں انھیں لاجواب کرتی ہیں جو ایک امی زندہ زبان سے ادا کی گئی تھیں تو یہ لوگ اس جاہلانہ نعرہ کو دہرلتے ہیں جواب سے چودہ سو سال پہلے عرب کی غیر متمدن جاہل قوم نے اپنے ناقص خیال فذعم میں لگایا تھا کہ ان کی معلومات کو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے کے کچھ لوگوں سے سن لیا تھا اور پھر یہ

سوچ کردہ اپنے اضطراب میں ناقابلِ بیان حالات سے دوچار ہوجاتے ہیں، جب یہ قرآن کے علمی حقائق سے مطالعہ کرتے ہیں اور دل اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ آپ کے زمانے سے قبل کبھی منکشف نہیں تو اسے حضور کی ذکاوت و ذہانت پر محمول کرتے ہیں اور مزید حیرت و اضطراب میں ڈوب جاتے ہیں۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن کے آسمانی ہونے کا تصور بھی ان کی فہم سے بالاتر ہے ان کا انکار ہے اور یہ دعویٰ ہے کہ اسلام گزرے ہوئے مذاہب اور خاص طور پر مسیحیت اور یہودیت کی ملی جلی تصویر ہے۔ اس دعوے کے لیے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے سوائے چند نکات کے جو اسلام اور ادیانِ سابقہ کے بعض اصول سے موافق ہیں اور وہی ان کے اعتراضات کا دارومدار ہے۔ خاص طور پر یہودی مستشرقین جن میں "گولڈزیہر" اور "شافٹ" سرِ فہرست ہیں مصر ہیں کہ اسلام کا اصل منبع یہودیت ہے اور وہ اس کے اصولوں سے بڑی حد تک متاثر ہے۔

مسیحی مستشرقین اسی دعوے کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ بلکہ کچھ اضافوں کے ساتھ ان کے مؤید ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی بھی شریعت سے آزاد و تہی دست ہیں۔ ان کے پاس صرف کچھ اخلاقی اصول ہیں جن کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ انھوں نے اسلام پر اپنا اثر ڈالا۔ اسلام ان سے متاثر ہوا اور اس نے ان اصول

سے بہت کچھ لیا ہے۔ شاید وہ یہ سمجھتے ہیں کہ آسمانی مذاہب میں ایک دین کا دوسرے دین سے مختلف ہونا ضروری ہے اور وہ دین جو کسی ایک نبی کے ذریعہ آیا ہو، دوسرے دین سے یکلخت مختلف ہونا چاہیئے۔ فتعالی اللہ عما یقول الظلمون علوا کبیرا۔

مستشرقین کی ایک کوشش یہ بھی رہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں شکوک وشبہات پیدا کئے جائیں۔ وہ احادیث جو ہمارے علماء کے نزدیک قابل اعتماد ہیں یہ مستشرقین ان کو تسلیم نہیں کرتے اور اس پر تحریف وتبدیل کا الزام لگاتے ہیں۔ وہ ہمارے علماء کی ان علمی کاوشوں سے لاعلم ہیں جو انھوں نے حدیث کی حفاظت وانتخاب کے لئے صرف کی تھیں۔ انھوں نے اس کے لیے دقیق ودور رس قواعد وضع کئے تھے اور اس میں حد درجہ بالغ نظری اور آزادی سے کام لیا تھا جس کا عشر عشیر بھی ان مستشرقین کے پاس موجود نہیں ہے جس کی وجہ سے ان کی معتبر کتابوں کی سند غیر معتبر ہو چکی ہے۔

اس ظلم پر آمادہ کرنے میں سب سے بڑا سبب ان کی وہ حیرت وپریشانی ہے جو ہماری حدیث شریف کی فکری ثروت اور شریعت کے وقار سے ان پر طاری ہے جب کہ وہ رسول ؐ کی نبوت کے بھی قائل نہیں

ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ باتیں کسی رسول سے نقل کی جا سکتی ہیں، اس لیئے یہ رسولؐ کی باتیں نہیں بلکہ گذشتہ تین صدیوں میں مسلمانوں کی طرف سے کچھ اضافے ہیں۔

ان اوہام وخرافات میں وہ نبوت سے انکار کردینے پر آمادہ ہوجاتے ہیں اس طرح فقہِ اسلامی کا عظیم قانونی سرمایہ جو دنیا کی تاریخ کے لیے نادرالمثال ہے۔ اس کی عظمت پردہ حواس کھو بیٹھے ہیں جس کی قیمت کم کرنے اور اس سلسلہ میں اس سے انتقام لینے میں انھیں ایک ہی راستہ دکھائی دیا کہ اسلامی قانون کو رومن لار (Roman Law) کا ماحصل قرار دیا جائے، یعنی فقہِ اسلامی خود مسیحیوں کے بنائے ہوئے قوانین سے ماخذ ہے لیکن یہ قابلِ شکر بات ہے کہ اس دعوے کی تردید تشفی بخش حد تک ہمارے علمار کے قلم سے سامنے آچکی ہے۔ دوسری ضرب کاری یہ بھی ہوئی کہ لاہئی، میں منعقد ہونے والی قانون کی علمی کانفرنس میں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ فقہِ اسلامی مستقل ایک قانون ہے جو کسی دوسرے قانون کا محتاج و ضرورت مند نہیں ہے۔

عربی زبان کے قدیم سرمایہ علم پر تشکوک اٹھے اور کوشش کی گئی کہ ہم اپنی زبان کی بقا کے لئے نئی اصطلاحوں کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔ انھوں نے عربی زبان کی تاریخ اور اس کی جدید نشو ونما پر اعتراضات کئے اور کوشش کی کہ عربی زبان اپنا فطری مذاق کھو کر یورپین زبانوں

کی طرف اپنا رخ موڑ دے گویا یہ ایک دوسرا ادبی سامراج تھا جسے وہ فوجی سامراج کے ساتھ ملانا چاہتے تھے۔

یہ وہ علمی اور عملی مصالح ہیں جن پر آج بھی بہت سے اہلِ قلم عمل پیرا ہیں۔

دینی وسیاسی مصالح ومقاصد

انھوں نے مسلمانوں میں قرآن مجید، شریعت اور فقۂ اسلامی کو مشتبہ کیا اور ان کو دو قسموں میں تقسیم کیا۔ ایک دینی، دوسرا سامراجی۔ اس تقسیم سے مسلمانوں کے تمدن و کلچر میں اشتباہ پیدا ہونا شروع ہوا اور اس دعوے کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ اسلامی تہذیب دراصل رومن کلچر کی دین ہے۔ عرب اور مسلمان اپنے کسی خالص تہذیب و تمدن سے تہی دست ہیں، ان کے پاس کوئی ندرت آمیز ثقافت نہیں۔ کبھی کبھی جب وہ اسلامی تہذیب کے بعض گوشوں کی مدح سرائی بھی کرتے ہیں (اور یہ بھی کم ہوتا ہے) تو اسے ضمنی طور پر بیان کرکے نقائص کا انبار لگا دیتے ہیں۔

انھوں نے مسلمانوں کے علمی ورثہ کو ضائع کرنے کے لیے ان کے عقیدے اور دوسری اخلاقی قدروں کے قابلِ اعتبار رہنے میں شک وشبہات کی روح پھونکی تاکہ سیاسی سامراج کے لیے اگلا قدم آسان ہوتا چلا جائے اور اسے اپنی تبلیغ میں کوئی رکاوٹ پیش نہ

آئے اور وہ اس کے زرخرید غلام بن جائیں۔

انھوں نے اسلامی مساوات اور بھائی چارگی کو اپنے لیے پُرخطر سمجھ کر اس کے خلاف جدّوجہد کی۔ عربوں میں فرد اور جماعت میں قومیت کے جذبات کو ابھارا اور مری گڑھی صداؤں کی بازگشت کی اور اس طرح آپس کے جذبات کو برانگیختہ کر کے تفرقہ پیدا کیا جو آج پورے عالم اسلام میں یہ فتنہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا ہے۔ وہ آپس کے شیرازہ کو بکھیرنے، یکجہتی و یک زبانی کو ختم کرنے اور اپنے ذہنی منصوبوں کے تحت حقائق کی تحریف، انفرادی حادثات کو تاریخی دستاویز بنانے بلکہ اسلام کی ایک انوکھی تاریخ سازی میں مصروف ہیں۔

اس کے سوا کچھ خالص علمی مقاصد بھی ان کوششوں میں شامل ہیں جس سے محض بحث و تحقیق عرب اور اسلام کی تہذیب و تاریخ کا مطالعہ مقصود ہے تاکہ پوشیدہ حقیقتیں سامنے آئیں، لیکن اس قسم کے اسکالرز (محققین) کی تعداد بہت کم ہے۔ ان میں بسا اوقات ناحق غلطیاں ہوتی رہتی ہیں جنھیں حقائق سے تھوڑا سا بھی ربط نہیں ہوتا جس کی وجہ یا تو عربی زبان کے اسلوب سے ناواقفیت ہے یا اسلامی تاریخ کی بے لوث تحقیق کے مذاق سے دوری۔ وہ اپنے اخلاص کے باوجود تاریخ کا مطالعہ ان بنیادوں پر کرتے ہیں جو ان کے ماحول کے لیے سازگار ہوں۔ یہ بھول جاتے ہیں کہ تاریخ کے ادوار میں مختلف

قسم کی قدرتی، نفسیاتی، زمانی اور مکانی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اسی سبب قدیم و جدید کی تاریخ میں بڑا فرق ہو جاتا ہے۔ یہ گروہ تینوں قسموں میں اپنے مقاصد کے اعتبار سے بہرحال مخلص و پاکیزہ ہے اور اس راستہ میں خطرات بھی بہت کم ہیں جس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ بہت جلد صحیح راستہ پالیں گے۔

ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی فکر و دماغ کو کام میں لاکر مطالعہ کرتے ہیں اور اپنے علمی نتائج میں حق و سچائی، حقیقت شناسی سے بہت قریب ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ہمارے دوسرے مستشرقین کا موردِ الزام بن جاتے ہیں اور ان پر بہت جلد علمی دنیا سے انحراف کا الزام لگ جاتا ہے جیسا کہ "آرنلڈ" کے ساتھ ہو چکا ہے۔

"آرنلڈ" نے اپنے عرق ریز مطالعہ کے بعد مسلمانوں پر مبصرانہ نظر سے "الدعوۃ الی الاسلام" کے نام سے کتاب لکھی جس میں ان مسلمانوں کے دینی تسامح اور اپنے مخالفین کے ساتھ دفاع کی کمی پر توجہ دلائی ہے۔ واقعی اس کتاب کو اسلام کی تاریخ میں بڑے حوالہ کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے بارے میں عام مستشرقین اور خاص طور پر مشنری چلانے والے افراد یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس کا مصنف بڑی حد تک مسلمانوں کے ساتھ جانب دار واقع ہوا ہے اور اس نے اس میں اپنے ذاتی جذبات سے کام لیا ہے۔ اس چھوٹی سی جماعت کے بعض لوگوں نے اسلام کی دعوت اور مغربی عوام کے کردار، اسلام کے دفاع کے سلسلہ

میں خالص حق سے متاثر ہو کر بحث کی ہے۔ جیسا کہ مشہور فرانسیسی مستشرق "ڈینیہ" کو مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

مستشرق مذکور ایک عرصہ تک الجزائر میں مسلمانوں کے ساتھ رہے اور متاثر ہو کر اسلام قبول کیا اور اپنا نام ناصرالدین "ڈینیہ" رکھا۔ موصوف نے ایک الجزائر کے عالم کی نگرانی میں سیرت پر تصنیف کی۔ کتاب کا نام "اشعۃ خاصۃ علی نبوۃ الاسلام" ہے۔ اس نے اس میں اپنی قوم کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے پیغام پر عمل پیرا ہونے کی تبلیغ کی ہے۔ اسلام کی حالت میں فرانس میں انتقال ہوا اور بعد میں نعش الجزائر میں دفن ہوئی۔

رسائل و تصنیفات

مستشرقین نے اپنی مہم کو چلانے اور اپنی تحقیقات و آراء کی اشاعت کے لیے ہر ممکن وسیلہ کو اپنایا جن میں سے چند قلمبند ہیں :-

۱- اسلام سے متعلق مختلف موضوعات پر کتابیں تالیف ہوتی رہتی ہیں جس میں اسلامی نقطہ نظر، قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ جن میں سے اکثر نصوص اور متن کی تحریفات پر مشتمل ہوتی ہیں۔

۲- مجلات و رسائل کی اشاعت جس میں اسلام اور بلاد عربیہ کو موضوع بحث بنایا جاتا ہے۔

۳- عالم اسلام میں مشنریوں کا قیام، جو بظاہر انسانی خدمات اور گرام سدھار کے نام پر سماجی خدمات انجام دیتی ہیں لیکن ساتھ ہی اپنے پرخطر اور دور رس نتائج لوگوں کے دلوں میں چھوڑ جاتی ہیں۔ ان خدمات کے تحت ہسپتال، ڈسپنسریاں، یونین، کالج، یتیم خانے اور مہمان خانوں کا انتظام بہت سے مقامات پر باقاعدہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ مسیحی نوجوانوں کی بہت سی انجمنیں عالم اسلام میں قائم ہو چکی ہیں۔

۴۔ یونیورسٹیوں اور علمی سیمیناروں میں محاضرات ومقالات کا انتظام اور اس سلسلہ میں سب سے پُرافسوس اور پُرخطربات جو اسلام کے لیے مضر ہوسکتی ہے، یہ ہے کہ ہمارے اسلامی ملکوں میں یونیورسٹیوں اور سیمیناروں میں شرکت کے لیے انھیں دعوت دی جاتی ہے۔ قاہرہ، دمشق، بغداد، رباط، کراچی، علیگڑھ کے علمی مراکز میں انھیں اظہار خیال کا پوری آزادی کے ساتھ موقع ملتا ہے جس سے فائدہ اٹھاکر وہ اپنے خیالات بڑی آزادی سے عوام تک پہنچا سکتے ہیں۔

۵۔ مقامی صحافت میں مقالات کی اشاعت کے بل بوتے پر انھوں نے ہمارے ملکوں سے نکلنے والے جرائد کی بڑی تعداد کو خرید کر رکھا ہے۔ ڈاکٹر عمر فرخ اور ڈاکٹر مصطفےٰ خالدی کی مشترکہ کتاب "التبشیر والاستعمار" جسے استشراق کے سلسلہ میں بڑے مرجع یا (SOURCES) کا درجہ حاصل ہے، اس کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"مسیحی کارکنانِ اشاعت کے اعلان کے مطابق انھوں نے خاص طور پر مصر کی صحافت سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا اور اس کے ذریعہ انھیں عیسائی نظریات کی اشاعت میں جس قدر مدد ملی وہ شاید ہی کسی دوسرے ملک میں مل سکتی ہو، ان کے بے شمار مضامین مصر سے نکلنے والے رسائل میں شائع ہوچکے ہیں جن میں سے اکثر اجرت کے ساتھ اور بہت کم اعزازی طور پر چھپے ہیں۔"

۶۔ اپنے ذہنی خاکوں کو عملی شکل دینے کے سلسلہ میں کانفرنسوں کا انعقاد ہوتا ہے جس میں ظاہراً صرف عام عنادلپند سے بحث کی جاتی ہے ۔ یہ کانفرنسیں ۱۸۷۳ء سے لے کر اب تک برابر منعقد ہوتی رہی ہیں۔

۷۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (Encyclopaedia of Islam) کی اشاعت جو "دائرۃ المعارف" کے نام سے مختلف زبانوں میں شائع ہوئی ہے اور اب دوبارہ اس کے نئے ایڈیشن شائع ہونے لگے ہیں۔ عربی میں سب سے پہلا ترجمہ ۱۹۵۶ء میں ہوا جس کی اب تک ۱۳ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان مستشرقین نے "اسلام کے نام پر لکھی جانے والی اس "دائرۃ المعارف" میں زہر گھول کر خرافات و اباطیل کا ذخیرہ جمع کیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے تہذیب یافتہ طبقہ کے نزدیک اس کتاب کو مصدر کی حیثیت حاصل ہوتی جا رہی ہے اور اسے "کتاب الحوالہ" سمجھ کر اس سے دلیل قائم ہونے لگی ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ محض اسلامی ثقافت سے ناواقفیت اور کم عقلی کی دلیل ہے۔

یہ مستشرقین، اسلام، ان کی اقسام، مقاصد و رسائل کا مختصر سا جائزہ تھا۔ اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ضمن میں ہم اپنے معاصر مستشرقین کے اہم فن کاروں، ان کی مشہور تصنیفات اور اہم ترین صحفات و رسائل کا ذکر بھی کر دیا جائے جو سامراجی ملکوں میں

ان کی نگرانی میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

صحافت و رسائل

الف : ۱۸۸۷ء میں فرانسیسیوں نے مستشرقین کی ایک انجمن قائم کی اور ۱۹۲۰ء تک اسے مزید شکوہ حاصل ہوا جس کے سہارے پر انھوں نے "اسیویۃ" کے نام سے رسالہ نکالا۔

ب : ۱۸۲۳ء میں لندن سے نے علوم شرقیہ (Islamic Studies) کی ہمت افزائی کی غرض سے ایک انجمن قائم کی اور اس کے زیر نگرانی رسالہ مجلہ "الجمعیۃ الاسویۃ للملکیۃ" شائع کیا۔ اسی صدی میں امریکی مستشرقین کے زیرِ اہتمام نکلنے والے رسائل میں مجلہ "دراسات الشرقیہ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ صوبہ (Ohio) کے شہر (Cambiér) سے شائع ہوتا ہے جس کی مختلف اشاعتیں ایک ہی وقت میں روس، لندن اور دوسرے مقامات سے منظرِ عام پر آتی ہیں۔ معلوم نہیں اس وقت اسی نام سے شائع ہوتا ہے یا کسی دوسری شکل میں۔ لیکن بہر حال اس پر سیاسی سامراج کی گہری چھاپ ہے۔ گو کہ یہ کام بعض مذہبی مشکلات کی وجہ سے کسی دوسرے وقت پر ٹلتا رہا ہو۔

ھ : اس وقت امریکی مستشرقین کے قلم سے نکلنے والے رسائل میں مشہور ہیں۔ مجلہ "شئون الشرق الاوسط"۔ سیاسی چھاپ اس پر بہت زیادہ ہے۔

و : ان نکلنے والے رسائل میں سب سے پرہول اور خطرناک مجلات وہ میں جسے آج کل امریکی مستشرقین کی باقاعدہ مشنریاں نکال رہی ہیں جن میں صموئل نویمر (Zwemer) کے زیر ادارت نکلنے والا رسالہ "العالم الاسلامی" The Muslim World خاص طور پر سرفہرست ہے۔ یہ رسالہ ۱۹۱۱ء میں پہلی بار منظر عام پر آیا اور اب بھی اسی نام سے (امریکہ) سے شائع ہوتا ہے۔ آج کل اس کے مدیر اعلیٰ کینیٹ کراج (K.Gragg) میں۔

ز : اسی سے ملتا جلتا رسالہ جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے "العالم الاسلامی" سے مشابہ ہے۔ فرانسیسی مشنری کے زیر نگرانی (L.Mado Muselmans) منتشر ہے۔

مشہور مستشرقین اور ان کی تصنیفات

ا ۔ جے آربرے (J. Arberry) مشہور انگریز مستشرق ہے جس کی اسلام دشمنی ضرب المثل بن چکی ہے۔ اسلامک انسائیکلوپیڈیا کے مرتبین میں سے ہے۔ موصوف کل کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں۔ باعثِ ملال بات یہ ہے کہ وہ ہمارے معاصر مصری بھائیوں کے جنہوں نے علومِ اسلامیہ میں اختصاص پیدا کیا ہے استاذ رہ چکے ہیں اور ان میں بھی یہ روح ملتی ہے۔ ان کی مشہور ترین کتابیں درجِ ذیل ہیں:۔

۱۔ "الاسلام الیوم" ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی۔
۲۔ "مقدمۃ التاریخ التصوف" ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی۔
۳۔ "التصوف" ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔
۴۔ "ترجمۃ القرآن" " "

الفرڈ جیوم (A. Geom) ہمعصر انگریز ہے اسلام کے خلاف تعصب رکھنے والے میں سرایت کر چکا ہے۔ انگلینڈ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں لیکچرار ہے۔ اس کے اسلوب طرزِ کتابت پر مشنری روح کا غلبہ ہے۔ اس کی تصنیفات میں معرکۃ الآراء کتاب "الاسلام" ہے۔

مصری حکومت نے اس کے پاس تعلیم یافتہ بہت سے نوجوانوں کو مشرقی علوم کی تحقیقات کے لیے بیرونی ملکوں میں اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے۔

بارون کیراڈی فوں (Baran Carrade Voux)

فرانسیسی مستشرق ہے۔ اسلامک انسائیکلوپیڈیا کے مرتبین میں اس کا نام اہم پارٹ ادا کرنے والوں کی فہرست میں ہے۔

ایچ۔اے۔آر گب (H.A.R.Gibb) انگلینڈ کے ہم عصر مستشرقین میں ہے۔ مصری لینگویج اکیڈمی کا ممبر رہا ہے۔ آج کل امریکہ میں اسلامیات کے پروفیسر ہیں۔ "دائرۃ المعارف" کے مرتبین و ناشرین میں سے ہیں۔ ان کی مشہور کتابوں میں چند یہ ہیں :۔

۱۔ "طرق الاسلام" اس کی تالیف اس نے دوسرے لوگوں کے مشترک طور پر کی ہے۔ کتاب انگریزی سے عربی میں ترجمہ ہوئی۔

۲۔ "الاتجاہات الحدیثۃ فی الاسلام" ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی جس کی کئی بار اشاعت ہو چکی ہے۔ عربی زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوا ہے۔

۳۔ "المذہب المحمدی" ۱۹۴۷ء میں پہلی بار شائع ہوئی اور اس کے بعد کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

۴۔ "الاسلام والمجتمع العربی" مختلف حصوں میں شائع ہوئی ہے۔ مصنف مذکور کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس کی ترتیب میں شریک ہیں۔

۵ - اس علاوہ اس کے متفرق مقالات کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

گولڈ زیہر (Goldziehar) اپنی علمی بددیانتی، عداوت اور خطرات کے لیے کسی تعارف سے زیادہ مشہور ہے۔ دائرۃ المعارف کی ترتیب میں اس کا حصہ رہا ہے۔ قرآن مجید اور حدیث کے موضوع پر خاص طور پر قلم اٹھایا ہے۔ اس کی کتابوں میں "تاریخ مذاہب التفسیر الاسلامی" کو کافی شہرت حاصل ہوئی جس کا عربی میں ترجمہ ہوا ہے۔

جان مائی نارڈ (Mynard) متعصب امریکی ہے۔ رسالہ "دراسات الشرقیۃ" کے مشاف میں رہے۔ خاص طور پر اسلام کے متعلق جدید کتابوں کی تاک میں رہتے تھے۔ ان کی زہر افشانی دیکھنے کے لیے رسالہ مذکور کے عدد ۲ مجلہ کے صفحہ ۲۲ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

ایس ایم زویمیر (S.M.Zweimer) مشہور مستشرق ہے۔ اسلام کے ساتھ دشمنی بہت زیادہ ہے۔ "العالم الاسلامی" رسالہ کا بانی اور "الاسلام تحد العقیدۃ" کا مصنف ہے۔ یہ کتاب ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس نے کتاب "الاسلام" کی اشاعت کی ہے یہ کتاب ان مقالات کا مجموعہ ہے جو مشنری سلسلہ کی کانفرنس منعقدہ لکھنؤ ۱۹۰۱ء میں پڑھے گئے تھے۔ اس کی علمی سرگرمیوں کو سراہنے کے لیے امریکیوں نے ایک اوقاف قائم کیا جس کے تحت "لاہوتی مطالعہ" اور مبلغین کی جماعت تیار ہوا کرتی ہے۔

عزیز عطیہ سوریال مصری مسیحی مستشرق ہے۔ اسکندریہ

کی یونیورسٹی میں استاذ تھے اور اب امریکہ کی کسی یونیورسٹی میں استاد ہیں اسلام اور مسلمانوں کے سلسلہ میں بہت زیادہ حاسد واقع ہوئے ہیں اور اسلامی تعلیمات میں تحریف کا بڑا حصہ انہی سے منسوب ہے۔ اپنے اس کینہ کی تائید کے لیے انھوں نے بہت سے حیلوں کو اختیار کیا ہے صلیبی جنگوں سے متعلق ان کی بہت سی تصنیفات ہیں۔

جی فون گرد باوم (G. Von Grew Boun)

اصلاً جرمن کی یہودی نسل سے ہے۔ بعد میں امریکہ کو اپنا مستقر بنائے رکھا اور وہیں تدریس شروع کی شیکاگو یونیورسٹی میں پروفیسر بھی رہے اسلام سے سخت دشمنی ہے۔ اس کی تمام تصنیفات میں اسلامی اقدار پر دیوانہ وار اعتراضات کی بوچھار ملتی ہے۔ لکھنے میں بہت مہارت پائی ہے، بہت سے مستشرقین نے اسے داد تحسین دی ہے۔ اس کی مشہور کتابوں میں چند درج ذیل ہیں :-

۱۔ "اسلام العصور الوسطیٰ" ۱۹۴۶ء میں چھپی۔
۲۔ "الاعیان المحمدیۃ" ۱۹۵۱ء میں چھپی۔
۳۔ "محادلات فی شرح الاسلام المعاصر" ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی۔
۴۔ دراسات فی التاریخ الثقافۃ الاسلامیۃ" ۱۹۵۴ء میں چھپی۔
۵۔ "الاسلام" مختلف مقالات کا مجموعہ ہے ۱۹۵۷ء میں چھپی۔
۶ "الوحدۃ والتنوع فی الحضارۃ الاسلامیۃ" ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی

فلیپ حتی

فلیپ حتی (P.H.Hitte) لبنانی مسیحی مستشرق ہے
برنسٹن یونیورسٹی میں پہلے اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر تھے، اس کے
بعد اسی شعبہ کے ہیڈ بنے اور آج کل معاشیات کے استاد ہیں اسلام
سے دشمنی میں بہت زیادہ جری واقع ہوئے ہیں۔ امریکہ میں عربی زبان
کے مسائل کے دفاع پر مظاہرہ کرنے والوں میں سے ہیں۔ آج کل امریکہ
کی وزارت خارجہ کے کاؤنسلر (Councellor) ہیں۔ ان کی تمام
کوشش ہے کہ انسانی تہذیب کی تشکیل میں اسلام کی کوتاہی ثابت ہو
کر رہے۔ دوسری طرف یہ بھی ناگواری ہے کہ مسلمانوں کی طرف کسی
مرتبہ و شرف کی نسبت ہو۔ نمونہ کے لیے ان کا فرمودہ "دائرۃ المعارف
الامریکیہ" سے ملاحظہ ہو۔ مطبوعہ سنہ ۱۹۴۸ء ص ۱۲۹ پر "الادب العربی" کے
عنوان سے لکھتے ہیں:۔

"ادبی زندگی کی نئی علامتیں پہلے سے نہ تھیں ان کا ظہور
۱۹ ویں صدی کے اخیر میں ہوا ہے۔ اس نئی تحریک کے
قائدین میں صف اول میں لبنان کے نصاریٰ ہیں جنھوں
نے امریکی مبلّغین کی کوششوں اور علمی جدو جہد سے تعلّم
کی منزل طے کر کے اس سے نئی روشنی اخذ کی ہے۔"

ان کی ساری کوشش یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے فضل و علم
کو ناقص قرار دیا جائے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی رائے کے مطابق یہ
کوتاہی و قصور صرف عصر جدید ہی کے لیے نہیں بلکہ اسلامی تاریخ

کے ہر مرحلہ میں ناکام رہا ہے ۔ ان کی یہ رائے خود ان کی اپنی تصنیفات میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان کی بعض کتابیں یہ ہیں :۔

۱۔ "تاریخ العرب" اصلاً انگریزی میں لکھی گئی۔ اس کے بعد کئی ایڈیشن شائع ہوئے ۔ ساری کتاب اسلام پر طعنہ زنی اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر تمسخر سے بھری پڑی ہے۔ اس کی ساری تحریر زہریلی آگ اور کینہ سے بھرپور ہے۔ کراچی سے نکلنے والے رسالہ (Al-Islam) کے شمارہ اپریل ۱۹۵۸ء کے صفحہ ۱۳۸ پر ملاحظہ ہو۔

۲۔ "تاریخ سوریا"

۳۔ "اصل الدرو دیانتہم" ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔

اے۔ جے۔ ونسینک (A.J. Wensinink)

اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت ترین دشمن ہے مصر کی لسانی اکیڈمی کا ممبر رہا ہے۔ بعد میں ڈاکٹر طیب حسن ہواری نے ایک نظریاتی جذبہ ابھار کر مجلس سے علیحدہ کیا۔ موصوف "المستشرقون و الاسلام" کے مؤلف ہیں جو ۱۹۲۶ء میں تالیف ہوئی لیکن یہ سب کچھ اس کے بعد ہوا جب مستشرق مذکور قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اپنا زہر اگل چکے تھے ۔ اس کا دعویٰ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہبی اور فلسفیانہ قدیم کتابوں کا مطالعہ کر کے قرآن مجید کی تالیف خود کی ہے ۔ اس کی یہ رائے کتاب "المستشرقون

والاسلام" کے ص ۷۱ پر دیکھی جا سکتی ہے۔

ونفینیک کی دوسری کتاب جو مشہور ہے "عقیدۃ الاسلام" ہے جو ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی۔

کینٹ کراج (K.Crang) نسلاً امریکی ہے جو اسلام سے فطرتاً سخت بغض ہے۔ ایک زمانہ تک قاہرہ میں امریکی یونیورسٹی میں تدریس کا مشغلہ رہا۔ آج کل "العالم الاسلامی" کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مشنری "اللاہوت المسیحی" کے صدر ہیں ان کی کتاب "دعوۃ المبشرین" مشہور ہے جو ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔

لوئی ماسنیون (L.Massegaon) فرانسیسی مشہور مستشرق ہے شمالی افریقہ میں فرانس کی وزارت نوآبادیات کا ایڈوائزر رہا۔ مصر میں قائم ہونے والی مشنریوں کا روح رواں ہے۔ اس نے عالم اسلام کو کئی بار دیکھا اور پہلی جنگ عظیم میں ۵ سال فرانسیسی فوج کی خدمت کی۔ وہ مصر کی لنگویج اکیڈیمی اور دمشق کی "المجمع العلمی" کا ممبر رہا ہے۔ اس نے خاص طور پر فلسفہ اور علم تصوف میں امتیاز پیدا کیا۔ اس کی مشہور کتابوں میں "الحلاج الصوفی الشہید فی الاسلام" ہے یہ کتاب ۱۹۲۲ء میں چھپی۔ کتاب کے علاوہ متعدد مقالات و محاضرات کے مجموعے نکل چکے ہیں۔ "دائرۃ المعارف الاسلامیۃ" میں لکھنے والوں میں سے ہے اور اس کی ترتیب میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔

ڈی بی۔ ماکڈونالڈ (D.B.Macdonald) امریکی ہے

اسلام اور مسلمانوں سے متعصب واقع ہوا ہے۔ اس کی تحریروں میں تبلیغی مشن کی روح ملتی ہے۔ یہ بھی "دائرۃ المعارف الاسلامیہ" کے قلمکاروں میں سے ہے اس کی مشہور کتابوں میں :-

۱۔ کتاب "تطور علم الکلام والفقہ والنظریۃ الدستوریۃ فی الاسلام" جو ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔

۲۔ اسی طرح دوسری کتاب "الموقف الدینی والحیاۃ فی الاسلام" مطبوعہ ۱۹۰۸ء خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مایلز گرین (M. Green) رسالہ "المشرق الاوسط" کے سیکریٹری ہیں۔

مجید قدوری عراقی عیسائی ہیں۔ واشنگٹن کی یونیورسٹی میں اورینٹل اسٹڈیز کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ہیں اور مجلسِ علومِ شرقیہ کے بھی سرگرم رکن ہیں۔ اسلام اور حامیینِ اسلام سے تنگ نظری آخری حد تک پہنچ چکی ہے۔ اس کی شاہکار کتاب جو اسلام سے حسد و کینہ میں واقعی شاہکار ہے "الحرب والسلام فی الاسلام" ہے جو ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ اور مقالات بھی شائع ہوئے ہیں۔

ڈی۔ ایس مارگولیس نسلاً انگریز ہے۔ انسائیکلوپیڈیا کے مرتبین میں سے ہے یہ بھی مصر و دمشق کی اکیڈمی کا ممبر رہا ہے اس کی مشہور کتابیں یہ ہیں :-

۱۔ "التطورات المبکرۃ فی الاسلام" مطبوعہ ۱۹۱۳ء

۲۔ "محمد و مصطلح الاسلام" مطبوعہ ۱۹۰۵ء۔
۳۔ "الجامعۃ الاسلامیۃ" ، ۱۹۱۲ء۔

نیکولسن (R.A.Nicholson) انگلینڈ کا ہم عصر مستشرق ہیں۔ "دائرۃ المعارف" کے محررین میں سے ہیں۔ انھوں نے اسلامی فلسفہ اور تصوف کو اپنا موضوع بحث بنایا ہے۔ مصر کی لسانی اکیڈمی کا ممبر رہے ہیں۔ تصوف سے دلچسپی اور انہماک کے باوجود اسلام کے روحانی نظام ہونے سے اتفاق نہیں ہے۔ انھوں نے اس دین کو سطحی اور پست مذہب قرار دیا ہے ان کی دو مشہور کتابیں :۔
۱۔ "متصوفو الاسلام" مطبوعہ ۱۹۱۰ء
۲۔ "التاریخ الادبی العربی" مطبوعہ ۱۹۳۰ء۔

مارغلی ہوں رسالہ "الشرق الاوسط" کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ ان کا یہ رسالہ شرق اوسط کے سیاسی اور ثقافتی امور میں سب سے زیادہ جدت پسند واقع ہوا ہے۔

ہنری لامنس اصلاً فرانسیسی ہے۔ (۱۸۶۲ء—۱۹۳۷ء) "دائرۃ المعارف" کے قلم کاروں میں سے ہے۔ اپنی عداوت بغض اور اسلام دشمنی میں بہت سوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اس کی عداوت اسلام کی چند مثالیں جمعیۃ الدراسات الشرقیۃ' کے شمارہ ۹، نومبر ۱۹۲۵ء ص ۱۵ اور ۱۶ پر ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔
فرانسیسی کتابوں میں اس کی دو کتابیں "الاسلام اور الطائف" ہیں

ان کی لکھی جانے والی کتابوں اور تصنیفات میں بعض ایسی اہم کتابیں بھی آئیں جن میں بہت سے لوگوں میں مقبولیت عام حاصل ہوئی اور لوگ انھیں قابل اعتماد مصدر سمجھنے لگے جس کی مختصر سی فہرست تعارف کے طور پر درج کی جارہی ہے۔

۱۔ دائرۃ المعارف الاسلامیۃ (Encyclopaedia of Islam)
دنیا کی مختلف زبانوں میں آچکی ہے اور اس وقت تک متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ نئی طباعتوں میں مختلف اجزاء نئے سامنے آئے ہیں۔
انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب ہے جیسا کہ آپ نے ابھی ملاحظہ فرمایا مستشرقین کی پوری ٹیم کام کرتی ہے۔ مندرجہ کتب کے مرتبین کا ذکر پچھلے صفحات پر گزر چکا ہے۔ ان کو اس وقت سب سے بڑے مرجع کا درجہ حاصل ہے

۲۔ (Short Encyclopaedia of Islam)
موجز دائرۃ المعارف الاسلامیۃ

۳۔ (Encyclopaedia of Religion and Ethicl)
دائرۃ المعارف من قسم الدین

۴۔ (Encyelopaedia of Socia l Scinces)
دائرۃ المعارف العلوم الاجتماعیۃ

Studies in History

دراستہ فی التاریخ

اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق لکھی کتابیں مندرجہ ذیل ہیں :-

۱- "حیاۃ محمد" صلی اللہ علیہ وسلم
آرنلڈ ٹوین بی A-Tovnbe

۲- "الاسلام"
سر ولیم مویر W. Muir

۳- "دین الشیعۃ" الفرڈ گیوم A. Geom

۴- "تاریخ شارل الکبیر" D. M. Donolson

۵- "الاسلام" ترپن Bishop-Turpin

۶- "الاسلام تحدتعقیدۃ" ہنری لامنس H. Lammor

۷- "دعوۃ المتذنۃ" زویمر S.M. Zwemer

۸- "الاسلام الیوم" کینیٹ کراج K. Cragg

۹- "ترجمۃ القرآن" اے جے آربری- A. J. Aberry

۱۰- "تاریخ مذاہب التفسیر الاسلامی" A. J. Aberry

۱۱- "تاریخ العرب" گولڈزیہر Gold Zieher

۱۲- "الیہودیۃ فی الاسلام" فلپ حتی Hitte

۱۳۔ "عقیدۃ الاسلام" ابراہیم کاش Abraham.Kasl
۱۴۔ الحلاج الصوفی فی الشہید فی الاسلام ونسنک Wensink
۱۵۔ "الحرب والسلام فی الاسلام" لوئی ماسینیون Massignon
۱۶۔ "تطور علم الکلام والفقہ والنظریۃ الدستوریۃ فی الاسلام"
مجید قدوری
۱۷۔ "الاتجاہات الحدیثۃ فی الاسلام"
میکڈونالڈ (Mcdonald)
۱۸۔ "طریق الاسلام" اے۔آر گب Gibb
۱۹۔ "التصوف فی الاسلام"
۲۰ "مصادر تاریخ القرآن" نیکولسن Nicholson
۲۱ "اصول الاسلام فی البیئۃ المسیحیۃ"
آرتھر جیفری Arthur Jeffry
۲۲۔ "مقدمۃ القرآن" آربل
۲۳۔ "التطورات المبکرۃ فی الاسلام"
۲۴۔ "محمد مصلح الاسلام"۔ ڈی۔ایس مارگولیس D.S.Margolious
۲۵۔ "الاسلام" " " "
۲۶۔ "الجامعۃ الاسلامیۃ" " " "
۲۷۔ "نظرۃ الی الاسلام" " "
۲۸۔ "اسلام العصور الوسطیٰ" اریک بنجان

۲۹۔ "الاسلام" ون گرونبام (G. Von. Grunebaum)
۳۰۔ "الاعیاد المحمدیۃ" "
۳۱۔ "الوحدۃ والتنوع فی الحضارۃ الاسلامیۃ" "
۳۲۔ "دراسات فی تاریخ الثقافۃ الاسلامیۃ" "

"دائرۃ المعارف الاسلامیۃ" یا "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" کے اہم ترین قلمکار اور محققین :۔

۱۔ ابراہام کاش ۔ کتاب "الیہودیۃ فی الاسلام" کا مصنف بھی ہے۔

۲۔ سی سی ۔ ایڈمز (C.C.Adams)
امریکن یونیورسٹی کے تدریسی عملہ میں رہ چکا ہے۔ "الاسلام الجدید فی مصر" کا مصنف ہے۔

۳۔ ادوار دایر۔ واشنگٹن کی یونیورسٹی میں استاد ہیں۔

۴۔ ادورا فرمان (E. Ferman)
"تاریخ المسلمین وفتوحاتہم" کا مصنف بھی ہے۔

۵۔ ایڈون کیلورلی (E. Calverly) "رسالۃ العالم الاسلامی" کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے اہم ترین مرتبین میں سے ہیں۔ قاہرہ میں امریکن یونیورسٹی میں استاذ رہ چکے ہیں۔

۶۔ اریک شرودر۔ انھوں نے "امت محمدیہ" کے نام سے ۱۹۵۵ء میں کتاب لکھی تھی۔

۷۔ ایلڈر (Elder) رسالہ "العالم الاسلامی" کے مرتب ہیں۔

۸۔ الفرڈ کارلٹون (J. Eisenberg) حلب کالج کے پیجر اور ربد میں بیرونی مشنری کے نائب صدر رہ چکے ہیں۔

۹۔ ایزنبرج I. Eisenberg "دائرۃ المعارف الاسلامیہ" کی ترتیب میں شریک رہے۔

۱۰۔ ال، ایزنبرج

۱۱۔ ڈبلو، ایوانو	W. Iwanow
۱۲۔ بابنجر	F. Babenger
۱۳۔ اے باگیارو	Bagharo
۱۴۔ جے۔ بارتھ	J. Barth
۱۵۔ آر۔ پیرٹ	R. Peret
۱۶۔ آر۔ بسٹ	R. Besst
۱۷۔ لیشب	Bishib
۱۸۔ سی۔سی۔ برگ	C.C. Berg
۱۹۔ ایچ۔ ایچ۔ برو	H.H. Brau
۲۰۔ ایچ۔ ال۔ پروونسل	L. Provinsal

۲۱۔ آر۔ بل (R. Bell) موصوف نے کچھ کتابیں بھی تصنیف کی ہیں جن میں "اصول الاسلام فی البیئۃ المسیحیۃ" مطبوعہ ۱۹۳۶ء اور "مقدمۃ القرآن" مطبوعہ ۱۹۵۴ء خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۲۲- ایم پلنسر Plenser

۲۳- ایف- بول F. Buhl

۲۴- وی- ٹی- لیشنر V.T. Buchner

۲۵- جے- بیدرسن J. Bederson موصوف دمشق کی مجلس علمی ACEDAMY کے ممبر رہ چکے ہیں اور آج کل کسی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔

۲۶- اے- ایس- بیورڈج A.S. Beveridge

۲۷- ایس- ایچ- بیکر S.H. Beaker

۲۸- آئی- ایس- ٹریٹون A.S. Tritton

۲۹- آر- چوڈی R. Chudi

۳۰- ٹی- ایچ- جائی نابال T.H. Juynboll

۳۱- گا- ڈفرائی ڈیمیاٹنس Gaude Froy Demombynes موصوف نے حج کے متعلق ایک کتاب بھی لکھی ہے جو اسلام دشمنی کی عکاس ہے۔

۳۲- ڈبلیو- جورکومن W. Piorkmon

۳۳- گویڈی Guedi دمشق کی اکیڈیمی کے ممبر رہ چکے ہیں۔

۳۴- بی- گوئیل B. Goel

۳۵- گی- ڈوسوڈ Guy Dussaud

۳۶۔ ڈی ایل۔ ڈلا ویڈا D.L. Dell Vida

۳۷۔ ڈی۔ بور D: Boor

۳۸۔ ڈی ٹریش Dietrich

۳۹۔ ای۔ ڈائنٹ E. Dinet موصوف نے فرانسیسی زبان میں "الشرق والغرب" کے نام سے کتاب بھی لکھی ہے۔

۴۰۔ آر۔ رابرٹ R. Robert ان کی دو کتابیں زیادہ مشہور ہیں :-

۱۔ "القوانین الاجتماعیۃ فی القرآن" ۱۹۲۵ء

۲۔ "القرآن والتوراۃ فی القوانین الاجتماعیۃ" مطبوعہ

۴۱۔ ایچ ریکنڈارف Rekendorf

۴۲۔ کے۔ ایف زیٹرسٹین K.F. Zettersteen

۴۳۔ او۔ اسپائس O. Spies

۴۴۔ ایم۔ اسٹریک (M. Srreck) ان کی کتاب "تاریخ الحرب الصلیبیۃ" شائع ہو چکی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔

۴۵۔ ایچ اسپیر (H. Soeyer)

۴۶۔ Snouk Horgronie

۴۷۔ R. Siestman

۴۸۔ بی۔ شریک B. Schricke

۴۹۔ جے۔ شلیف J. Shlaifer

۵۰۔ ایس۔ بلیسر

۵۱۔ C. Van Arendonk

۵۲۔ H. Fucks

۵۳۔ کے۔ ولرز K. Vollers

۵۴۔ الیف۔ ودکا F. Dooka

۵۵۔ اے۔ فیشر A. Fisher

۵۶۔ کارل بروکلمان (Karl Brockelman) موصوف اصلاً جرمن ہیں۔ جرمنی زبان میں عربی ادب کی تاریخ لکھی ہے۔ "تاریخ الشعوب الاسلامیہ" بھی انھی کی تصنیف ہے۔ دمشق کی مجلس علمی کے رکن رہ چکے ہیں۔

۵۷۔ آر۔ اے۔ کرن R.A. Kern

۵۸۔ کور Cour

۵۹۔ کوستی ولسن K. Wilson

۶۰۔ کریمرز J.H. Kramers

۶۱۔ لانگ ورتھ ڈیمس Lorg. Warth Dames
ان کی اسلام دشمنی ضرب المثل بن گئی ہے۔

۶۲ T. Luwichi

۶۳ Bernard Lewis ان کی مشہور کتاب "العرب فی التاریخ"

ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔ آج کل صاحب کتاب لندن یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔

۶۴۔ C.Marsain

۶۵۔ T.Menzel

Moerrison

۶۶۔ V.Minorrkle

۶۷۔ Nallino

۶۸۔ نیلینو

۶۹۔ ایچ۔ ایس۔ نیبرج H.S.Neberg

۷۰۔ ہارٹنر Hartner ان کی کتاب "الاسلام والقومیۃ" شائع ہو چکی ہے۔

۷۱۔ ہارٹمان (Hartman)

۷۲۔ ایچ ڈیون H.Dunne

۷۳۔ ایچ ریڈ (H Reed) موصوف ترکی عیسائی مشنری کے صدر ہیں۔

۷۴۔ M. Houtsmr

۷۵۔ J.Horovits

۷۶۔ H.Hongman

۷۷۔ A.J. Huisman

۷۸۔ B. Hellee

۷۹۔ W. Hoifening

۸۰۔ Huart

۸۱۔ ایم۔ واٹ M. Watt ان کی کتاب "الجبر والاختیار فی الاسلام" شہرت عام حاصل کر چکی ہے۔

۸۲۔ جے۔ والکر J. Walker

۸۳۔ جی۔ وٹک P. Witteck

۸۴۔ C. Young

۸۵۔ (L. Mado Musl

۸۶۔ J. Welhousen

ان کی شخصیت ان کی کتاب "تاریخ الیہود" میں نمایاں ہے۔

یہ ان مستشرقین کی مختصر سی فہرست تھی جنھوں نے "انسائیکلو پیڈیا آف اسلام" کو ترتیب دیا ہے۔ گو کہ ان کی تعداد شمار سے بھی زیادہ ہے، لیکن ان میں اہم ترین شخصیتوں کے اسماء درج کیے گئے ہیں۔

مستشرقین کا معیارِ بحث

عام طور پر مستشرقین اسلامیات کے موضوع پر بحث کرتے وقت اس علمی دنیا میں بھی انتہائی اجنبی غیر مانوس اور تعجب خیز طریقے اختیار کرتے ہیں۔ حالانکہ کسی بھی علمی میدان میں کسی مخلص محقق (ریسرچ اسکالر) کے لیے اپنی نفسانی خواہش یا شخصی میلان کو مدِّ نظر رکھنا معیوب تر سمجھا جاتا ہے۔ وہ کسی بھی موضوع پر بحث کرتے وقت موضوع کی مناسبت سے معتبر ذرائع و نصوص پر پوری فکری آزادی سے سوچتا ہے اور اس کے بعد اس کا فیصلہ اس کی اپنی فکر کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے۔

لیکن ہمارے مستشرقین میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو بہت پہلے سے اپنے ذہن میں ایک نقشہ متعین کر لیتے ہیں۔ اور پھر اپنے ذہنی تصوّرات کو عملی دنیا میں لانے اور ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان دلائل سے بحث کرتے وقت وہ نصوص و مراجع کی صحت کا خیال رکھے بغیر اس کے نتائج سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور انھیں صرف اپنی شخصی رائے کے ثبوت کے لیے کسی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اکثر و بیشتر وہ کسی بھی امر کلی کو کسی جزئی حادثہ سے مستنبط کرتے ہیں جس کی وجہ سے انھیں بہت دور کے فاصلے طے کرنے ہوتے ہیں۔ اگر اس میں ان کی خواہشات اور خود غرضی کو دخل نہ ہوتا تو میر الیقین ہے کہ وہ ان وقتی واقعات کو دلائل نہ بنا سکتے تھے۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

مشہور مستشرق گولڈزیہر (Gold Zieher) کا خیال ہے کہ حدیث کل کی کل تیسری صدی کی پیداوار ہے اور یہ اصلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال نہیں ہیں۔ اس کا دعویٰ ہے کہ شریعت اسلامی کے احکام اسلام کے عہدِ اول میں مسلمانوں کے نزدیک جانے بوجھے نہ تھے۔ یہی نہیں بلکہ اس قسم کی ناواقفیت اور خاص طور پر حضور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ سے ناآشنائی بڑے بڑے ائمۂ اسلام سے وابستہ رہی ہے۔

اس دعوے کی دلیل میں موصوف مستشرق نے بعض جھوٹی سچی روایتیں نقل کی ہیں۔ مثلاً دمیری کی کتاب "کتاب الحیوان" سے نقل کیا گیا ہے کہ :۔

"امام ابوحنیفہؒ یہ نہ جانتے تھے کہ غزوۂ بدر، احد سے پہلے ہوا تھا یا بعد میں"

لیکن غور کریں کہ وہ شخص جسے تھوڑی بھی تاریخ سے دلچسپی اور سوجھ بوجھ ہو، وہ اس روایت کو کس طرح تسلیم کر سکتا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ان مشہور ائمہ اسلام میں سے ہیں جنھوں نے اسلام میں احکام حرب سے متعلق مسائل کی تدوین کی ہے۔ یہی حال ان کے خاص تلامذہ امام یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم کا ہے جن کی فقہی کتابیں ان موضوعات پر عظیم مرجع کا مقام رکھتی ہیں۔ اور شہرت عام کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں حق کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل بلکہ محال ہے کہ یہ آئمہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مغازی سے ناواقف تھے۔

اس موضوع پر ہمارے لیے صرف دو کتابوں کا ذکر کر دینا کافی ہوگا جنھیں اسلام کے فقہی لٹریچر میں کتاب الحوالہ کی حیثیت حاصل ہے۔

پہلی کتاب امام ابو یوسفؒ کی کتاب الرد علی سیر الاوزاعی اور دوسری امام محمدؒ کی کتاب السیر جس کی شرح امام سرخسیؒ نے کی ہے۔ یہ کتابیں فقہ اسلامی کے اہم مراجع میں شمار ہوتی ہیں۔ آخر زمانہ میں یہ کتاب "جامعۃ الدول العربیۃ" کے زیر اہتمام جمعیۃ محمد الحسن الشیبانی کی زیر نگرانی شائع ہوئی ہے۔ مذکورہ دونوں کتابوں میں امام اعظمؒ کے تلامذہ رشید کی گہرائی علم اور وسعت مطالعہ کا پتہ چلتا ہے جو امام صاحبؒ کے علم کے خوشہ چین ہیں۔ جن کے ذریعے ہمیں عہد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلامی معرکوں اور خلفائے راشدینؓ کے غزوات کا علم ہوا۔

گولڈزیہر پر یہ کتابیں مخفی نہیں ہیں، موصوف کے لیے ممکن تھا کہ

اگر ان کی نیت بخیر ہوتی تو پہلے ان کتابوں کا مطالعہ کرتے۔

اس سے قطع نظر کہ امام ابوحنیفہؒ سیرت سے ناواقف تھے یا اس پر علم کامل رکھتے تھے، موصوف نے اپنی پہلی دلیل کے لیے دمیری کی کتاب کا سہارا لیا ہے جو نہ کوئی مستند مورخ ہیں اور نہ ہی فقہ و تاریخ میں انھیں کوئی مقام حاصل ہے۔

حقیقتاً صاحبِ کتاب نے اپنی کتاب میں حکایات و نوادرات کے ضمن میں ہر رطب و یابس کو جمع کر دیا ہے جو اس موضوع سے کچھ میل رکھتی تھیں۔ اس نے اس میں کسی صحت کا خیال ملحوظ نہیں رکھا۔ پھر دوسری طرف امام اعظمؒ کے سلسلہ میں مقلدین و غیر مقلدین کا فکری اختلاف بھی بہت واضح ہے۔ ان میں سے بعض امام صاحبؒ کی شان کے خلاف گستاخیاں کرتے ہیں اور بعض ان کی شخصیت پرستی میں مبتلا ہیں۔

لیکن گولڈزیہر نے ان سب باتوں سے آنکھیں بند کر کے امام ابوحنیفہؒ کی علمی تاریخ سے تجاہل اختیار کیا ہے اور ایک ایسی جھوٹی روایت پر اعتماد کر بیٹھے ہیں جو کسی مبتدی طالب علم کو بھی قابلِ اطمینان نہیں بلکہ باعثِ تمسخر ہے۔

پھر اس دلیل سے انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تیسری صدی ہجری کی پیداوار ہے۔

۲۔ موصوف مستشرق کی تنگ نظری کی دوسری مثال دیکھیے:۔

انھوں نے جرح و تعدیل کی تمام قابلِ اعتبار کتابوں سے آنکھیں

بندگر کے محمد بن مسلم شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ (۵۰ - ۱۲۴ھ) کے صدق و اخلاص پر حملہ کرتے ہوئے یہ ثابت کر دیا ہے کہ امام زہریؒ امویوں کے لیے حدیثیں جمع کرتے تھے اور حدیث لا تشد الرحال الا الی ثلاثة مساجد (صرف تین مسجدیں ایسی ہیں جن کے لیے رخت سفر باندھا جا سکتا ہے) کو انھوں نے عبدالملک بن مروان کے لیے وضع کی تھی۔

ان کی دلیل یہ ہے کہ امام موصوف عبدالملک بن مروان کے معصر تھے۔ اس سلسلہ سے مکمل جواب السنة ومكانتها فى التشريع الاسلامی میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

۳۔ مستشرقین کی یہ کوشش رہی ہے کہ وہ عربوں کی بلندی و افضلیت سے عجمی مسلمانوں میں کم مائیگی اور نقص و کمی کا احساس پیدا کریں۔

مشہور مستشرق بیرو کلمان نے اپنی کتاب "تاریخ الشعوب الاسلامیة" میں عربی مسلمانوں کو عربوں کے مقابلہ میں مختلف گوشوں سے "رعیہ" میں شمار کیا ہے جس کے معنی عربی لغت میں "بکری کے ریوڑ" سمجھے جاتے ہیں۔ ایسے وقت یہ لوگ تمام معتبر ذرائع تاریخ کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔

لفظ "رعیة" سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے استنباط کیا ہے کہ عرب عجمی مسلمانوں کو "ریوڑ" کی حیثیت سے دیکھتے تھے حالانکہ اگر لغت کا سہارا لیا جائے تو (راعی) کے معنی ذمہ دار اور پرسان حال کے بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے کلام عرب میں رئیس القوم کے

لیے الراعی کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے ساتھ حفاظت و نگہبانی کے معانی بھی پوشیدہ ہیں۔

اسلام نے اس کا اطلاق قوم پر کیا ہے ایسے دلائل کے سامنے بعض لوگوں کا استثناء اور اختصاص کس طرح ثابت ہو سکتا ہے۔ بڑی حد تک اس لفظ کا اطلاق عوامی اور شخصی زندگی پر بھی کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں وارد حدیثیں زیادہ واضح ہیں۔

الا کلکم راع و کلکم مسؤل عن رعیتہ فالامام الذی علی الناس راع وھو مسؤل عن رعیتہ والرجل راع علی اھل بیتہ وھو مسؤل عن رعیتہ والمرأۃ راعیۃ علی اھل بیت زوجہ وھی مسؤلۃ عنھم

ترجمہ: "تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور اپنی ذمہ داری کے سلسلہ میں ہر شخص سے سوال ہوگا۔ لوگوں پر امام بھی ذمہ دار ہے اور وہ اپنی اس نگہبانی کے سلسلہ میں مسئول ہے۔ مرد اپنی بیوی اور اہل بیت کا نگہبان ہے اور اسی کے بارے میں اس سے سوال طلب ہوگا۔ عورت اپنے گھر والوں کی ذمہ دار ہے اور اس ذمہ داری کے تحت وہ بھی مسئول ہے۔"

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری ۱۳/۹۶ میں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ راعی ایسے امانت دار مخلص نگہبان کی تعبیر ہے جو

پوری امانت کے ساتھ اپنی ذمہ داری محسوس کرے جس کے ساتھ رعایا اور مصالح کا التزام بھی ضروری ہے۔

اس کے بعد موصوف مستشرق نے ان حقائق سے آنکھیں بند کریں اور اپنے علم کے لیے اس دعویٰ کو کافی سمجھ لیا کہ عرب مسلمانوں نے عجمی لوگوں کو بکریوں اور بھیڑوں کی طرح دیکھا ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے ان پر رعیہ کا اطلاق کیا ہے۔

کیا صاحب موصوف کے پاس اس سے زیادہ بڑی کوئی دلیل ہے کہ لفظ کا اطلاق بکریوں کے گلّہ پر بھی ہوتا ہے؟ مگر یہ کیسے متعین ہو سکتا ہے کہ لغت میں مندرجہ معانی کی طویل فہرست میں کسی ایک لفظ کا تعین کر لیا جائے۔

صاف ظاہر ہے کہ یہ ان کی خود غرضی اور ہوا پرستی کا اعلان ہے۔

۴۔ مستشرق مالیور کا خیال ہے کہ مرجلیوٹ نے نقل کیا ہے کہ عرب کے بدو علم بلاغت اور زبان دانی کا فن سیکھنے میں غیر معمولی اہتمام کرتے تھے۔ اس لیے یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس فن میں مہارت حاصل کر لی ہو اور اس سلسلہ سے غیر معمولی مقام حاصل ہو گیا ہو۔

یہ چند مثالیں ان مستشرقین کے معیار بحث اور موازنہ و تنقید کی صلاحیت کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہیں۔ ان کے یہاں مسئلہ پہلے کسی ذہنی بنیاد پر قائم ہو جاتا ہے۔

عربوں میں دستور نہیں رہا کہ وہ بلاغت کے فن کو سیکھیں اور نہ ان کے لیے اس قسم کے وسائل اور مراکز تھے جہاں اس کے قواعد وضع کیے جاتے۔ پھر بھی یہ ثابت نہیں کہ حضورؐ نے نبوت سے پہلے کبھی ایسا کیا ہو، نہ ہمارے سامنے ایسی کوئی دلیل ہے جس سے رسولؐ کی تعلیم کا سراغ لگ جائے بلکہ کسی بھی تاریخی روایت سے ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن مجید کے نزول سے پہلے آپ نے کبھی شعر و نثر کا کوئی حصہ نقل کیا ہو۔

دوسری بات جس کا انکشاف ان کے ان علمی نمونوں سے کیا جا سکتا ہے، ان کی بحث و تنقید کی بنیاد ہے یعنی یہ لوگ اسباب و علل کے اختراع اور حوادث کے بنانے میں بہت زیادہ تفریط سے کام لیتے ہیں جس پر سوائے تخیلات کے کوئی دوسری سند نہیں ہوتی۔

مزید اضافہ اس سے ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ عرب اور مشرق کے رسم و رواج اور کسٹمس (CUSTOMS) کو ان کے عادات و اخلاق کو اپنے اوہام اور خیالات کی کسوٹی پر دیکھتے ہیں اور اس بنیاد پر مسلمان عرب اور مشرق کے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں۔

یہ لوگ اس حقیقت کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ ہر سوسائٹی کے علیحدہ معیار ذوق اور رسم و رواج ہوتے ہیں۔

فرانسیسی مسلمان مستشرق "ناصر الدین الدینیہ" نے مستشرقین کے اسلوب، معیار اور کسوٹی کے سلسلہ میں بڑی اچھی بات کہی ہے کہ مستشرقین نے

نے سیرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ظہورِ اسلام کی تاریخ کو اپنی مزاجی اور عقلی معیار، خود فہمی پر جانچنے کی کوشش کی ہے۔ یہ لوگ اسی نقطۂ نظر سے اس پر بھی تنقید کرتے ہیں۔ یہی ان کی گمراہی کا سبب ہے حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ یورپین مستشرقین کے متعلق کردہ معیارِ مشرق اور انبیاء علیہم السلام کی تاریخ سے صحیح نتائج اخذ نہیں کر سکتے۔

ناصر الدین ڈینیہ کا خیال ہے کہ مستشرقین جنھوں نے سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر نقد و تنقیص کی کوشش کی ہے چوتھائی صدی تک اس فکر میں رہے کہ کس طریقہ سے جمہور مسلمانوں کے اعتماد کو جو سیرتِ نبوی پر قائم ہے ٹھیس پہنچائی جائے۔

اس طویل منصوبہ بندی کے بعد ان کے لئے ممکن ہو گیا کہ روایات متواترہ اور ساب تک کی یقینی مقررہ آثار کو ختم کر سکیں لیکن اپنے مقصد میں انھیں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے؟ یہ ہنوز ایک سوال ہے۔

حقیقت میں یہ لوگ کسی مختصر سے پیمانہ پر بھی اس بات کو ثابت کرنے میں ناکام رہے۔ جب ہم ان کی نئی رائیوں اور تحقیقات کا مطالعہ کرتے ہیں جن کو ہمارے فرانسیسی، انگریز، جرمن اور ہالینڈ کے مستشرقین نے پیش کیا ہے تو ہمارے اس میں سوائے ایک مخلوط پیچیدگی کوئی دوسری چیز نظر نہیں آتی۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کی رائے کو رد کرتا ہے اور اپنی رائے کو منوانے کی کوشش ہوتی ہے جس کے بعد ان کی فکری

کوششیں عوام کے سامنے ٹھنڈی پڑجاتی ہیں۔

اس کے بعد وینیہ ؒ نے کچھ مثالیں دے کر لکھا ہے کہ:۔

اگر ہم ان متضاد رایوں کو جمع کرنا چاہیں تو ہمیں مدتوں سراغ رسانی کے باوجود بھی کسی ایک حقیقت کا پتا نہ چلے اور اس کے سوا کوئی صورت نہ ہو کہ اطمینانِ قلب کے لیے ہم عربوں کی لکھی ہوئی کتب کی طرف رجوع کریں۔ وہ مصنفین جنھیں یہ خوش گمانی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو علم و تحقیق کی کسوٹی پر پرکھیں۔ اس پر بھی وہ کسی نقطہ پر اتفاق نہیں کر سکے۔

اپنی تمام سراغ رسانیوں اور کاوشوں کے بعد بھی وہ اپنی منزل پا نہ سکے اور نہ ہی اس کے حدود تک پہنچ سکتے ہیں۔

ہمارے مستشرقین یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی عقل و فراست اور مشرق کی حکمت و بالغ نظری کے درمیان طویل فاصلے ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے انھیں بیچ کی خلیج کو پر کرنا ضروری تھا۔ اس کے بغیر ظاہر ہے کہ وہ ان اندھا دھند چپقلشوں میں باربار وہم و گمان کے بحرِ بیکراں میں ڈوبتے رہیں گے۔

بحوالہ (الرد علی الاب)

(لامنس الیسوعی)

مستشرقین سے ملاقاتیں

(نتائج و تاثرات)

میں نے مستشرقین کے بارے میں اپنی کتاب (السنّۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی) میں تھوڑی بہت بحث کی تھی لیکن اس وقت تک مجھے یورپ کی جامعات، مدارس اور دانش گاہوں کے مشاہدہ کا موقع نہیں مل سکا تھا اس لیے میں ان کے طرزِ فکر سے پوری طرح واقف نہ تھا۔ لیکن ۱۹۵۶ء میں پہلی بار مجھے اس کا موقع ملا اور اس وقت ان کے حسد بغض اور عداوتِ اسلام کا یقین ہوا تو میں ان کے بارے میں اپنی رائے پرایمان لے آیا۔

میری سب سے پہلی ملاقات پروفیسر اندرسن سے ہوئی۔ موصوف لندن یونیورسٹی میں پرسنل لاء کے ہیڈ تھے۔ یہ کیمبرج یونیورسٹی سے فارغ ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے موقع پر مصر میں برطانوی فوج کے رکن رہ چکے ہیں۔ یہ خود ان کی زبانی کہانی ہے کہ انھوں نے عربی زبان قاہرہ کی امریکن یونیورسٹی میں علمائے ازہر کے علمی محاضرات جس کے لئے انھوں نے ہفتہ میں صرف ایک گھنٹہ مقرر کیا تھا سیکھی تھی۔

اسی طرح انھوں نے اپنی ملازمت جنگ کے دوران مصری ماحول میں عامیہ زبان بھی سیکھ لی تھی۔ انھوں نے اسلامک اسٹڈیز (Islamic Studies) میں ان لیکچروں کے سہارے پر جو احمد امین، ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور مرحوم احمد ابراہیم دیا کرتے تھے، امتیاز خاص حاصل کیا اور پھر فوجی خدمت سے دست بردار ہو کر لندن کے شعبۂ سپل لا کے ہیڈ بن گئے۔

اسلام کے خلاف ان کے تعصب کی مثالیں یوں بہت زیادہ ہیں جو میں نے وہیں حمود دغرابو اسلامک کلچر سنٹر (Islamic Cultural Center) کے مدیر سے سنی تھیں لیکن میں انھیں بیان کرنا پسند نہیں کرتا اور خود موصوف کی زبانی بیان کردہ بات کا ذکر کرنا کافی سمجھتا ہوں۔ موصوف مستشرق نے کہا۔

"میں نے جامعہ ازہر کے بہت سے فارغین کو جنھوں نے فقہِ اسلامی میں لندن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنا چاہی تھی، رد کر دیا۔ کیونکہ انھوں نے اسلام میں عورت کے حقوق پر اپنی رائے کا اظہار کیا تھا اور ان کی رائے تھی کہ اسلام نے عورت کو کلی حقوق دیئے گئے ہیں۔"

مجھے اس بات سے تعجب ہوا تو میں نے موصوف سے سوال کیا کہ آپ نے اس سبب کے تحت انھیں کس طرح نظر انداز کر دیا جب کہ آپ لوگ اپنے اداروں میں آزادیٔ فکر کا اعلان کرتے ہیں۔

موصوف نے جواب دیا کہ صرف اس وجہ سے کہ انھوں نے عورت

کے بارے میں حقوق کا اظہار کیا تھا حالانکہ وہ اس کے قطعاً حق دار نہ تھے گویا کہ انھوں نے اپنے آپ کو ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ کے برابر سمجھ لیا اور اگر ان کی رائے ائمہ مجتہدین سے مختلف ہو تو گویا ان کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اسلام کو امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ سے زیادہ سمجھا ہے۔

موصوف ابھی زندہ ہیں لیکن معلوم نہیں کہ ابھی اسی عہدہ پر فائز ہیں یا اپنا مشغلہ بدل دیا ہے۔

مجھے ایڈنبرہ یونیورسٹی بھی دیکھنے کا موقع ملا، وہاں اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر ایک پادری تھے جو اپنے سنئے تمدنی لباس زیب تن کئے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے دروازے پر نام کے ساتھ مذہبی پیشوا ہونے کا لقب بھی لکھوا رکھا تھا۔

جلاسکو یونیورسٹی میں بھی اسلامیات کے پروفیسر ایک پادری تھے اور عیسائی مشنری میں ۲۰ سال تک بیت المقدس کے علاقہ میں مدرّ رہ چکے تھے جس کی وجہ سے انھیں عربی زبان میں کافی مہارت حاصل ہو گئی تھی۔ انھوں نے یہ حالات زبانی سنائے۔ اس سے پہلے میں ان سے عیسائی اسلامی کانفرنس منعقدہ لبنان سنہ ۱۹۵۴ء میں مل چکا تھا۔

آکسفورڈ OXFORD یونیورسٹی میں عربی و اسلامیات کے صدر ایک یہودی کو پایا جس سے صحیح طور پر عربی کی ادائیگی بھی نہ ہوتی تھی۔ انھوں نے بھی دوسری جنگِ عظیم میں برطانیہ کی طرف سے لیبیا میں انکوائری کا عہدہ سنبھالا تھا اور یہیں پر عرب ماحول میں عامیہ زبان سیکھی تھی۔

میرے لیے تعجب خیز بات یہ تھی کہ میں نے انھیں دیکھا کہ وہ استشراق کے طلباء کو قرآن مجید کی آیات کی تفسیر زمخشری کی تفسیر سے سمجھا رہے تھے حالانکہ ان سے عبارت کی ادائیگی بھی نہ ہوتی تھی۔ اسی طرح حدیث وفقہ کی امہات الکتب کے درس کے وقت جب میں نے ان سے ان کے مراجع کے بارے میں پوچھا تو فرمانے لگے کہ یہ ہمارے مستشرقین ہی کی تصنیفات میں۔ مثلاً :۔

گولڈزیہر ، مرجلیوت ، اور شاخت وغیرہ۔

کیمرج یونیورسٹی میں (Oriental Studies) علوم شرقیہ کے صدر مشہور مستشرق اربرے (Arbery) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے عربی ادب میں خصاص حاصل کیا تھا جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں گزر چکا ہے۔

موصوف نے مجھ سے اپنی گفتگو کے دوران کہا کہ ہم مستشرقین سے اسلام پر بحث کرتے وقت بڑی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ ہمارے لیے مناسب تھا کہ ہم اس میدان میں چھلانگ نہ لگاتے۔ آپ عرب مسلمان ان موضوعات پر غور و خوض کے زیادہ حق دار ہیں۔ ممکن ہے یہ الفاظ انھوں نے انکساری و تواضع میں کہے ہوں۔

مانچسٹر میں پروفیسر روبوسن (Roboson) سے ملاقات ہوئی اس وقت وہ سنن ابوداؤد کے نسخہ کو ایک قلمی نسخہ مخطوطہ سے ملانے

میں مصروف تھے۔ تاریخ حدیث پر ان کی کئی تصنیفات آچکی ہیں جن
وہ بڑی حد تک دوسرے مستشرقین کی رائے سے متفق ہیں میری خواہش
ہوئی کہ ان کے سامنے دراسات الاستشراق کے سلسلہ میں ان پر
وضاحت کروں کہ اس میں بڑی حد تک حقیقت سے بُعد ہے۔ میں
نے موصوف کے سامنے گولڈزیہر کی بعض غلطیاں رکھیں اور اس کی
علمی اور تاریخی لغزشوں کو پیش کیا۔

جس کے جواب میں انھوں نے کہا :-

"بلاشبہ اس زمانے میں ہمارے مستشرقین اسلامی
مراجع سے زیادہ واقف ہیں اور گولڈ کے زمانے کے
مقابلہ میں اب نشر و اشاعت کا سلسلہ زیادہ وسیع ہو گیا ہے
اس لیے آج کے مستشرقین کو گذشتہ دور پر نہیں پرکھا جا سکتا۔"

جس کے جواب میں میں نے کہا کہ اس بات سے امید کی جا سکتی ہے
کہ اب آپ مستشرقین اپنی علمی تحقیقات میں حق و انصاف کو زیادہ ملحوظ
رکھیں گے۔

لیڈن یونیورسٹی میں جرمن کے نمائندے یہودی مستشرق "شاخت"
سے ملاقات ہوئی۔ یہ بھی ہمارے زمانہ میں گولڈزیہر کے پیغام کے علمبردار
ہیں اور اسلام کی توہین، مکر و فریب اور حقائق کو مسخ کرنے میں کوئی
دقیقہ اٹھا نہیں چھوڑا ہے۔

میں نے ان سے ملاقات میں گولڈ یہر کی بعض اغلاط کو بیان کیا

کی نشاندہی کرتے ہوئے بحث کی اور ان کی کتابوں کی تحریفات نقل کیں تو پہلے تو انھوں نے اس سے انکار کیا، لیکن جب ہم نے حدیث کی تاریخ کے سلسلہ میں مثال دے کر بات ثابت کی تو انھیں تعجب ہوا۔ پھر گولڈزیہر کی کتاب دیکھی۔ ہم موصوف کی لائبریری میں بیٹھے رہے پھر انھوں نے ان غلطیوں کا اعتراف کیا اور کہا کہ اس سلسلہ میں گولڈ زیہر سے غلطی ہوئی ہے۔ میں نے کہا آپ صرف اس کو غلطی ملتے ہیں۔ اس پر چیں بہ جبیں ہوئے اور کہنے لگے، آپ کو گولڈ سے اس قدر بدگمانی کیوں ہے؟

جس پر میں نے عبدالملک بن مروان اور امام زہری کے موقف پر تنقید کے سلسلہ میں گولڈزیہر کی دوسری فاحش بددیانتی کی طرف متوجہ کیا اور بعض تاریخی حوالوں سے گولڈزیہر کے دلائل کی کٹ کی۔ اس موضوع پر طویل بحث کے بعد انھوں نے اسے بھی تسلیم کیا لیکن پھر بھی کہنے لگے کہ کیا علماء سے غلطیاں نہیں ہوتی ہیں؟

میں نے کہا۔ گولڈزیہر GOLD ZIHER اس مکتب استشراق کے بانی ہیں جس کا سارا انحصار قانون اسلامی کے تاریخی وثائق پر مبنی ہے۔ اس کے بعد بھی انھوں نے اس کے خلاف طریقہ کار کو کیونکر اپنایا؟ انھوں نے امام زہری پر مسجد اقصیٰ کی فضیلت والی حدیث کے وضع کرنے کا الزام کیونکر اور کس بنیاد پر لگایا ہے؟ صرف اس قیاس کے تحت کہ امام زہری عبدالملک بن مروان کی خوشنودی چاہتے تھے؟

حالانکہ امام زہری عبداللہ ابن زبیر کے قتل کے کئی برس بعد عبدالملک سے ملے ہیں۔

اس سے قبل آپس کی ملاقات بھی ثابت نہیں ہے۔ اس بات پر پروفیسر شاخت کے منھ کی ہوائیاں اڑنے لگیں اور انھوں نے ہاتھ ملنا شروع کر دیے۔

چہرہ پر اضطراب و غضب کی کافی بے چینی تھی جس پر میں نے اپنی گفتگو کو ختم کر دیا۔

میں نے ان سے کہا۔ اس جیسی بہت سی غلطیاں گذشتہ صدی میں مستشرقین سے ہوتی رہی ہیں اور متواتر یہ سلسلہ جاری ہے جنھیں اب علمی حقائق سمجھا جانے لگا ہے۔ اور ہم مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ ان تحقیقات کو مصنفین کی موت کے بعد پڑھتے ہیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ آپ مستشرقین ہماری گزارشات پر غور کریں گے اور اپنی زندگی ہی میں ان کی اصلاح کر کے علمی حقائق کو جلا بخشیں گے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مستشرق مذکور قاہرہ یونیورسٹی میں تدریس بھی رہ چکے ہیں۔ تاریخِ فقہ پر انھوں نے کتاب لکھی ہے جو سراسر تحریف و خرافات سے لبریز ہے اور اپنے استاد گولڈ کی نمائندگی کرتی ہے۔

جامعہ السلامیں بزرگ مستشرق "ینبرج" سے ملاقات ہوئی۔ آپ

اس وقت "الانتصار لابن الخیاط" کی تصحیح فرما رہے ہیں گفتگو کے دوران موصوف سے اسلامی تحقیقات پر بحث رہی۔ میں نے یہاں گولڈزیہر کو موضوع کلام بنا کر ان کے سامنے بھی اس کی غلطیاں اور حقائق کی تحریف کو پیش کیا جس کے جواب میں انھوں نے کہا:۔

"گولڈزیہر، گذشتہ صدی کے لیے مشہور تھا جو واقعی اس وقت مرجع علم بنا ہوا تھا لیکن اس زمانے میں جب کہ آپ کے اسلامی ملکوں میں اسلامی مطبوعات شائع ہو کر پھیل ہو چکی ہیں تو اس وقت گولڈزیہر کو مرجع علم ہونے کا حق حاصل نہیں ہے بلکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اب گولڈزیہر کا زمانہ گزر چکا ہے۔"

اس سفر کے دوران مجھے موقع ملا کہ میں مذکورہ جامعات و یونیورسٹیوں کے علاوہ بلجیکا، ڈنمارک، ہالینڈ، جرمن، سوئزرلینڈ اور روس کی راجدھانی کی یونیورسٹیوں سے بھی رابطہ قائم کروں۔ چنانچہ وہاں بھی مستشرقین سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

اس سلسلہ میں میں نے جو کچھ بھی نقل کیا ہے وہ میری ڈائری کے کچھ اقتباسات تھے جو میں نے مستشرقین کے تاثرات میں قلم بند کئے تھے۔ اس سلسلہ میں سفر کے دوران جن حقائق کا انکشاف ہوا، انھیں قلمبند کرتا ہوں:۔

● بلاشبہ مستشرقین (اپنی پوری برادری کے ساتھ) یہودی، پادری یا سامراجی ہوتے ہیں اور بعض ان میں سے ذہنی اعتبار سے کچھ زیادہ

آگے بڑھ جاتے ہیں۔

● استشراق کی تحریک سامراجی ملکوں میں زیادہ پر زور اور مغربی ممالک میں سست گام ہے۔

● ہمارے معاصر مستشرقین جو غیر سامراجی ملکوں سے وابستہ ہیں، گولڈزیہر اور ساس جیسے یہود یا بانت فلاسفہ کے تصورات سے خالی الذہن ہیں۔

● استشراق کے چشمے عموماً کلیسا سے پھوٹے ہیں اور سامراجی ملکوں میں ان کے ساتھ گرجا اور وزارتِ خارجہ پہلو بہ پہلو ساتھ ہیں۔

● سامراجی ممالک جیسے برطانیہ، فرانس، برابر کوشاں ہیں کہ استشراق کو تقلیدی رجحانات کی طرف موڑ دیں تاکہ وہ اسلام کے انہدام کا وسیلہ بن کر مسلمانوں کی شہرت و بلندی کو مسخ کرنے کا سامان مہیا کریں۔

چنانچہ آپ دیکھیں کہ فرانس میں بلاشیر اور ماسینون جو اس وقت مستشرقین کے مشائخ میں شمار ہوتے ہیں، فرانس کی وزارتِ خارجہ کی طرف سے عرب اور مسلمانوں کے معاملات میں انکوائری اور جانچ پڑتال کرنے والوں کے عہدوں پر فائز ہیں۔

انگلینڈ میں جیسا کہ میں نے ذکر کیا تھا، استشراق کو قابلِ احترام مقام حاصل ہے اور وہاں لندن، آکسفورڈ، کیمرج اور ایڈنبرہ کی یونیورسٹیوں میں غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے، جہاں یہودی، انگریز اور سامراجی و عیسائی مبلغین اس فن کی سرپرستی کرتے ہیں۔ ان کی

خواہش ہے کہ گولڈزیہر، مرجلیوٹ اور ان کے بعد شاخٹ کی تصنیفات ہی مغرب کے طلبائے استشراق کا مرجع علم بنی رہیں۔ مسلمان یا عرب نوجوان میں سے اگر کوئی ان کے یہاں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ اس سے متفق نہیں ہوتے کہ وہ اسلام کے عدل وانصاف اور مستشرقین کی تحریف وتشویہ کو موضوع بنا کر ان کے یہاں سے ڈگری حاصل کر سکے۔

ڈاکٹر امین المصری ازہر کے شعبہ اصول الدین کے سند یافتہ اور جامعۃ القاہرہ کے شعبۂ ادب سے فارغ التحصیل ہیں۔ انھوں نے ہم سے بیان کیا کہ انھیں اپنی درخواست کے سلسلہ میں جو انھوں نے ڈاکٹریٹ کے لیے دی تھی، کس طرح دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑا۔

وہ لندن یونیورسٹی میں فلسفہ کے مطالعہ کے لیے کئی سال پہلے پہنچ گئے تھے اور وہاں ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کر لی تھی، لیکن اس پر بھی انھیں علوم اسلامیہ کے مطالعاتی پروگرام میں شامل نہ کیا گیا۔ اور مستشرقین کے دباؤ سے مرعوب ہو کر انھوں نے اپنے THEASES کا موضوع شاخٹ کی کتاب "تاریخ فقہ اسلامی پر نقد" کو متعین کیا اور اپنی درخواست پروفیسر اندرسن کے پاس پیش کی کہ وہ اس کی اجازت دے کر نگرانی قبول کر لیں۔ لیکن موصوف مستشرق نے اس کی اجازت نہ دی اور ان کی یہ کوشش رائیگاں گئی۔

جب وہ لندن یونیورسٹی سے مایوس ہو گئے تو کیمرج کا ارادہ کیا اور

تبلیغی کارناموں اور تصنیفات سے ظاہر ہے جس کا ذکر مناسب موقع سے آچکا ہے۔

حسرت ناک پہلو یہ ہے کہ ہمارے نوجوان طلبہ جو انگریزی تعلیم کے لیے ان ملکوں کا چکر کاٹتے ہیں وہ ان کی امریکن یونیورسٹیوں میں داخلہ کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔ اس لیے اسلامک اسٹڈیز کے طلبار کو تعلیم کے مراجع نہیں مل پاتے اور ان کے سامنے سوائے زہریلے عناوین کے ڈاکٹریٹ کے لیے دوسرا موضوع نہیں ملتا جس کی وجہ سے وہ انھیں بے مغز کہانیوں کو حقیقت سمجھ لیتے ہیں جو ان کے مغربی فضلار و مصنفین کی تصنیفات کا نچوڑ ہیں۔

یہ وہ داعیہ ہے جو ہماری عرب یونیورسٹیوں اور مدارس کو نئے سرے سے سوچنے کی دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنی جامعات میں انگریزی میں ڈاکٹریٹ کی اسناد کا انتظام کریں۔

میرا خیال ہے کہ یہ عالم اسلام کے بہت سے طلبار کے نظریات کو بدل سکتا ہے اور ہم انھیں مغرب کے مقتل میں جانے اور سامراجی مستشرقین کے چنگل سے نکال سکتے ہیں۔

اس سے رابطہ قائم کرکے وہاں بھی دراسات الاسلام کے سلسلہ سے مستشرقین سے بعض موضوع پر ریسرچ کرنے کی درخواست کی. لیکن وہ لوگ بھی راضی نہ ہوئے۔ اس خوش گمانی پر انھوں نے صریح جواب دیا کہ اگر آپ یونیورسٹی سے کامیاب اسکالر بن کر نکلنا چاہتے ہیں تو شاخت پر نقد سے گریز کریں. بہرحال یونیورسٹی مذکورہ عنوان پر تحقیق کی اجازت نہیں دے سکتی. تب انھوں نے موضوع بدل کر معاییر نقد الحدیث عند المحدثین کو موضوع بنایا اور اس کی اجازت حاصل کی۔

یہ میرے تاثرات تھے جو مستشرقین کے بارے میں اور خاص طور پر گولڈزیہر اور اس کی تحقیقات کے مطالعہ کے بعد میرے ضمیر اور دماغ کا فیصلہ ہے۔ اس کے بارے میں میں نے اپنی کتاب "السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی" میں ایک خاص باب متعین کیا ہے جس میں اس یہودی مستشرق کے فساد اور مکر کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسلامی حقائق کو مسخ کرنے، نصوص کی تحریف، تاریخ کی تاویل اور دوسرے تخریبی مقاصد کی کوششوں کا پوسٹ مارٹم کیا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس کے بے جان علمی حقائق جو علمی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے انھیں بھی بیان کردوں تاکہ اس کے صحیح معیار علم کا پتہ لگ سکے۔

امریکہ آج بھی استشراق، اسلام اور مسلمانوں کی نمائندگی کر رہا ہے وہاں کے مدارس ودانش گاہوں کی سرپرستی اسلام کے سخت ترین دشمن کرتے ہیں جو اپنے تعصب وعناد میں بے مثال ہیں. جیساکہ ان کے

حرفِ آخر

جب سے صلیبی جنگوں نے جنگی اور سیاسی حیثیت سے شکستِ فاش کھائی ہے اس وقت سے لے کر آج تک مغرب اسلام اور مسلمانوں سے خوں بہا/انتقام لینے کی فکر میں درپے ہے۔ اس نے اس کے لیے ہر ممکن وسیلہ کو اختیار کرنا چاہا۔ سب سے بہتر طریقہ یہی تھا کہ اسلام کا اچھی طرح مطالعہ کیا جائے اور اس پر تنقید کے دروازے کھل پڑیں۔

قرونِ وسطیٰ کے ان فکری منصوبوں کی فضا میں جو اس وقت مغرب کے مسیحی معاشرہ پر چھائی ہوئی تھی، بلادِ اسلامیہ پر قبضہ و جاگیر کی نئی رو ابھری اور جب سے عالمِ اسلام نے سیاست، فوج اور ثقافت میں اپنا دم توڑنا شروع کیا، مغرب نے قوت و غلبہ کے زور سے عالمِ اسلام میں قدم جمانا شروع کیے۔ مغرب کا عالمِ اسلام پر رفتہ رفتہ تسلط شروع ہوا۔ یہ سلسلہ ابھی تکمیل کو بھی نہیں پہنچا تھا کہ اچانک مغرب میں اسلام اور اس کی تاریخ سے متعلق دراسات و تحقیقات کا رواج شروع ہوا جو تیزی سے پروان چڑھتا رہا جس کا مقصد اسلامی برادری میں سامراج کے لیے ہمنوائی کی فضا قائم کرنا تھا۔

گذشتہ صدی میں قدیم اسلامی علوم کے بڑے حصہ کا مطالعہ جو اپنی تاریخ اور ثقافتی گوشوں پر مشتمل ہے مکمل ہو چکا ہے اور یہ فطری تقاضا تھا کہ اسے حق سے چھپانے میں حقائق پر پردے ڈالے جائیں۔ اس سلسلہ میں پہلا عنصر دینی تعصب ہے جو یورپ کے سادات اور فوجی قائدین کے ساتھ ہمیشہ سے وابستہ ہے حتیٰ کہ وہ وقت آیا جب دشمن قومیں دوسری جنگ عظیم میں بیت المقدس پر امنڈ پڑیں۔ اس وقت لارڈ "ولینبی" نے اپنی دلنشیں تقریر میں کہا تھا:۔

"آج صلیبی جنگ فوجی حیثیت سے ختم ہو جائے گی"

رہا دینی تعصب، تو اس کے اثرات اب تک اہلِ مغرب کی اسلام اور اس سے متعلق تصنیفات میں موجود ہیں۔

اسلام کے ساتھ عادلانہ اور منصفانہ کتابیں اہلِ مغرب کے بعض ادباء اور محققین کے قلم سے لکھی گئیں۔ ان میں سے اکثر ایسے لوگ تھے جو مذہب کی چھاپ سے آزاد تھے۔

اس سلسلہ کی ضرب المثل کتاب "حضارۃ العرب" ہے جسے "جی لوبان" نے تصنیف کیا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو واقعی حق و انصاف اور پوری دیانت کے ساتھ لکھی گئی جس کا سبب صرف یہ ہے کہ مؤلف مذکور خاص مادی فلسفی ہیں۔ انھیں کسی دین پر ایمان نہیں ہے اس لیے وہ ہر مذہب کو سیکولر نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ دوسری وجہ اسلامی تہذیب کے ساتھ منصفانہ رویہ ہے۔ یہ دو حالتیں ہیں جس

کی وجہ سے اہلِ مغرب اسے اپنے ماحول میں قابلِ تحسین نگاہوں سے دیکھنا یا اس کے بارے میں کچھ سوچنا پسند نہیں کرتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ "گوبون" ۱۹ ویں صدی میں تاریخ اجتماع کے ماہرین میں شمار ہوتا ہے مگر اس کے باوجود اہلِ مغرب نے اسے نہیں سمجھا جیسا کہ ابھی ذکر آچکا ہے۔

دوسری وجہ یہ کہ علم و مادہ کی وہ زبردست طاقت جس پر اہلِ مغرب حاوی ہو چکے ہیں اور اٹھارہویں، انیسوی صدی میں اس کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں پہنچ چکی ہیں جس نے ان کے علماء اور اہلِ دانش میں غرور و تکبر کی بہت سی غیر پسندیدہ قدریں پیدا کر دی ہیں۔

وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ مصری تہذیب کے سوا اہلِ مغرب ہی تمام تاریخی تہذیبوں کی بنیاد ہیں اور مغرب ہی واحد دانش گاہ حقیقی ہے جو منطقی بنیادوں پر دور رس اور نتیجہ خیز نکات سوچ سکتا ہے۔

ان کے علاوہ سارے عقلی گہوارے اور خاص طور پر مکتبِ فکر اسلامی انتہائی جامد و فرسودہ کہیے، بلکہ یوں کہیے کہ اسلامی فکر و فلسفہ امور کے درک میں جزئیات کے سینکڑوں واسطوں کا پابند ہے اور اس میں یہ قدرت نہیں ہے کہ بات کا نتیجہ خیز ثبوت مل سکے۔

یہ مستشرق گب کی رائے ہے جیسا کہ اس کی کتاب "وجہۃ الاسلام" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے یہ رائے اپنی چشم دید حالات کی بنیاد پر قائم کی ہے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے ان قوموں کے ضعف و

انحطاط کو دیکھلے جن پر سامراج کی چھاپ لگ رہی ہے جس کی چھاؤں میں یہ قومیں زندگی کے ہر میدان میں پیچھے ہوتی جا رہی ہیں۔

اسی صدی کے شروع میں جب مغربی تہذیب سے ہمارا میل جول شروع ہوا اور ہمارے درمیان تہذیبی رشتے وسیع ہو گئے تو علماء مغرب کے سوا تہذیب یافتہ عناصر کے سامنے حصولِ علم کا کوئی سہل اور مجرّب راستہ نہ تھا۔

علوم غیر منظم ہو چکے تھے۔ اہلِ مغرب کے یہاں بھی علمی کتابوں کی کوئی تنظیم باقی نہیں رہ گئی تھی۔ چنانچہ مستشرقین ہی کی کتابیں سامنے آتی رہیں جنھوں نے اپنی عمریں ہماری تہذیب کے مطالعہ میں گنوائی تھیں اور بڑا قدیم کتابوں کے مصادر و مراجع اور تلاش و جستجو میں صرف کیا تھا، یہاں تک کہ وہ ایک ایک کتاب کی تالیف میں ۲۰، ۳۰ سال لگانے پر آمادہ ہو گئے اور ہماری تہذیب پر ان کی للکار شروع ہوئی۔ ان تالیفات میں انھوں نے تمام قدیم کتابوں کے مصادر جہاں تک ان کی دست رسی ہو سکی کھنگار رکھا ہے۔

اس مسلسل کوشش و جد و جہد، مکمل فرصت و فراغت کے ساتھ انجام دہی۔ دوسرے اپنی سامراجی پالیسی جس کا تقاضا تھا کہ یہ کام پورا ہو کر رہے، وہ اس بات پر قادر ہو گئے کہ ہماری تہذیب کو منظم طریقہ پر پیش کر سکیں۔ ان کی اس کوشش پر ہمارے تہذیب یافتہ عناصر کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور مستشرقین کی کوششیں بار آور رہنے لگے

لگیں۔ خاص کر اس وقت جب انھوں نے ہماری قدیم علمی کتابوں کی تحقیق شروع کی تو مستشرقین کی لکھی ہوئی کتابوں سے جوان کے لیے وسعت علم ونظر کی وجہ سے باعث تعجب تھیں، اقتباس لینا شروع کیے۔ انھیں یقین ہو گیا کہ مستشرقین سچی باتیں کہتے ہیں۔ یہ لکھنے والے اگر ہمارے فلسفہ پر فرضی حقائق کی مخالفت بھی کرتے ہیں تو ان کی رائے زیادہ مضبوط اور نتیجہ خیز ہے، اس لیے کہ یہ لوگ وسیع علمی پیمانوں پر غور کرتے ہیں جس سے وہ کبھی منحرف نہیں ہوتے۔ یہیں سے ان اہل مغرب کی علمی تحقیقات پر اعتماد اور ان کی آراء کا اعتراف شروع ہوا۔

ہمارے ان تہذیب یافتہ نوجوانوں کے ہاتھ یہ موقع نہ لگ سکا کہ وہ خود اسلامی نقطۂ نظر کا مطالعہ کرتے جن سے مستشرقین نے دل کھول کر استفادہ کیا ہے۔ جس کی وجہ ایک یہ تھی کہ ان کے لیے یہاں تک پہنچنا مشکل تھا۔ دوسرے علمی نتائج میں جلد بازی اور سطحی مطالعہ بھی۔ یہ ایک سبب بنا کہ حقائق کو پیش کرنے میں خواہشات کا سہارا لیا جائے۔ یہ جذبہ ہمارے علمی اور ذہنی حلقوں میں ابھرتا جارہا ہے۔

یہ زمانہ کی نئی کروٹ تھی جس میں نقص وضعف اور خود اعتمادی کی کمی کا احساس ہمارے اوپر مسلط ہوا اور ان مغربی مؤرخین کے آگے سپر ڈال دی گئی۔

سماج کے علمی ماحول میں انھیں قابل اعتماد سمجھا گیا اور فکری آزادی کے لیے ان کا سہارا لیا گیا۔

یہ احساس تہذیب و حقائق کے غلط مطالعہ کا نتیجہ تھا جو اسلام کے علوم و قوانین کے سلسلہ میں مستشرقین پر غیر معمولی اعتماد کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

رفتہ رفتہ یہ احساس تہذیب یافتہ طبقوں میں پیدا ہوا اور آج بھی اس طبقہ کی بڑی تعداد اسی اندازِ فکر کو اپنائے ہوئے ہے۔

مستقبل کے آئینہ میں

لیکن ضرور ہم خدا کے حکم سے اس درجہ کو پہنچنے والے ہیں اور اس دن کی آمد قریب ہے جب ہماری آنے والی نسلوں کو یہ تعجب ہوگا کہ ہم ان مستشرقین کے سامنے اس حد تک کیوں سر خم کیے ہوئے ہیں۔ عنقریب وہ دن آئے گا جب ہم مغرب کے اس سرمایہ علم کا پوسٹ مارٹم کریں گے اور ان کے دین، علم اور تہذیب کا ناقدانہ مطالعہ کریں گے۔

وہ دن بھی دور نہیں جب ہماری نسلیں ان اہل مغرب کے بنائے ہوئے معیارِ نقد کو اپنائیں گی اور خود انہی کے علم پر نقد و تحلیل کریں گی۔ اس وقت یہ تمام کارنامے ریت کے ذرّوں کی طرح بکھر جائیں گے اور ان میں مزید کمزوری و اضمحلال پیدا ہوگا اور وہ اثر اس سے زیادہ ہوگا

جو آج ہمارے علوم کے ساتھ ہو رہا ہے۔
فرض کریں کہ اگر مسلمان آج علمی تنقید کے لیے اسی معیار کو اختیار کر لیں جس پر مستشرقین قرآن و حدیث کو جانچتے ہیں، ان کی مقدس کتابوں کو موروثی علوم میں تنقید ہو تو ان کے مقدمات میں سے ان کے پاس کیا باقی رہ جائے گا اور پھر وہ کس ثبوت کو پیش کر سکیں گے۔
فرض کریں کہ اگر مستقبل میں مسلمان علمی نقد کے ان معیاروں کو استعمال کرنے لگیں جنھیں مستشرقین ہمارے علوم، تاریخ، ائمہ، تہذیب، ماخذین اور مقدسات پر تنقید کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں تو اس وقت جو لوگ اس کام کو اٹھائیں گے تو کیا وہ شک اور سوء ظن کے نتیجہ میں اس سے زیادہ حدود تک نہیں پہنچ سکیں گے جتنا کہ آج مستشرقین ہماری تہذیب و علوم کے بارے میں پہنچ چکے ہیں۔
یقیناً ایسے میں ان کی تہذیب باریک و بوسیدہ کپڑے کی طرح بے نقاب ہو جائے گی۔ اس تہذیب کے علمبردار علماء، سیاستدان اور ادباء کے رنگ فق ہو جائیں گے۔
میری سب سے بڑی تمنا ہے کہ ہم میں سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو اس تہذیب، اس کے علماء کی تاریخ کو اسی اسلوب میں پیش کرنا جانتے ہوں جس میں مستشرقین کھوئے ہوئے ہیں، یعنی گری پڑی باتوں اور واقعات کی تلاش، نصوص کے خلاف حقیقت کا اثبات اور محاسن کو سیئات کی تصویر دینا۔

اگر اس خواہش کی کبھی تکمیل ہوئی تو اس تہذیب اور قوم کی تصویر اتنی مضحکہ خیز ہوگی کہ اس سے مستشرقین بھی اجنبیت محسوس کریں گے۔

کیا اس کی امید کی جاسکتی ہے کہ ہم میں سے اس کام کے لیے کوئی تیار ہو اور اہلِ مغرب کے معیارِ نقد کو استعمال کرے، ان کی تہذیب و عقائد کو اسی اسلوب میں پیش کرے جس میں انھوں نے پیش کیا ہے پھر وہ دیکھیں گے کہ ان کا خود ساختہ طریقہ کس طرح انھی پر لوٹ آیا جس کے متعلق وہ کبھی سوچا کرتے تھے کہ وہ ہماری تاریخ اور ہمارے دین کو پہچاننے کا ذریعہ ہے۔ ممکن ہے اس وقت انھیں اس تحریف و گمراہ کردگی پر کچھ ندامت ہو جائے۔

مجھے یقین ہے کہ اب وہ زمانہ گزر چکا ہے جس میں ہمیں علم اور تاریخ کے مصادر کو سمجھنے کے لیے مغرب کے علوم کا سہارا لینا پڑتا تھا، حالانکہ ان کے مصادر ہمارے ہی خزانہ کا سرقہ ہے۔ اگر اس وقت اس سے ہم ناواقف تھے تو آج ہم اس جہالت کو دور کرسکتے ہیں۔ اپنی زبان، دین، عقیدہ اور علماء کی تاریخ کو سمجھنے کے لئے مغرب کے شرم آمیز سہارے توڑ سکتے ہیں، جس پر انھیں اطمینان ہے کہ ہم ان کے دیئے ہوئے اعتقاد کو اپنا کر اپنے دین اور علماء کو سوء ظن اور شکوک کی نظروں سے دیکھیں۔

اب وہ وقت ہے کہ ہم اس کی تکمیل کریں اور اپنے علمی خزانوں کو بکھیر دیں۔ اپنے شعور کی دی ہوئی چنگاری اور مستشفی آزادی کے احساس

کو دوبارہ زندہ کریں۔ اگر ایک طرف ہم ان محرّفین و گمراہ کردہ مستشرقین سے اس قدر متنفر ہیں تو دوسری طرف ان کے انصاف پسند مصنفین کو دادِ تحسین بھی دیتے ہیں جنھوں نے ہماری قدیم علمی کتابوں کی خدمت میں اپنی زندگیاں لگا دیں جنھوں نے حقائق سے بحث کی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ علم کسی کی شخصی جاگیر نہیں ہوتی۔

اسلام پورے عالم کا دین ہے۔ اس کے لیے ممکن نہیں کہ اس کے سمجھنے میں کوئی ایک قوم دوسری قوم پر فوقیت رکھتی ہو اور دوسری اس سے عاجز ہو۔ جو جس قدر چاہے اس بحرِ بیکراں سے اپنی پیاس بجھا سکتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اہلِ علم کی صفات اس کی شخصیت میں جلوہ گر ہوں۔ یہ صفات انسان کی پہلی منزل پر عدل و انصاف، اخلاص اور اعترافِ حق کا سبق دیتی ہیں۔

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم

(تعارف و حالات)

ڈاکٹر صاحب مرحوم بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں شام کے ایک مردم خیز اور شاداب شہر حمص میں پیدا ہوئے جسے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی خواب گاہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ مرحوم کا گھرانہ سینکڑوں برس سے علم و فضل کا گہوارہ تھا۔ ان کے آباؤ اجداد ہمیشہ سے حمص کی جامع مسجد کے امام و خطیب ہوتے چلے آئے تھے ان کے والد شیخ حسنی السباعی جامع مسجد کے امام اور خطیب تھے۔ اس لیے ان کی عقیدت و احترام بھی قدرتی تھا، علماء معاصرین سے بڑا ربط اور تعلق تھا اور باہم بحث و مباحثہ کا سلسلہ جاری رہتا تھا جن میں شیخ اپنے نو عمر کو شریک کرتے تھے، ڈاکٹر صاحب نے ان مجلسوں کا ذکر خود اپنے الفاظ میں بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے[1]

والد صاحب کی اس صحبت علم اور مسلسل مشغولیت اور ان پر دینی

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے رسالہ حضارۃ الاسلام فلسطین۔

اور علمی چھاپ کا طبعی اور نفسیاتی نتیجہ تھا کہ مرحوم سباعی کھیل کود اور تفریحی پروگراموں سے الگ تھلگ ہو کر بچپن ہی سے علم دین حاصل کرنے میں لگ گئے۔ اپنے والد بزرگوار کے ہمراہ ہر وقت رہتے تھے اور ان کی علمی مجلسوں سے مستفید ہوتے۔ قومی مشغلہ اور وطنی خدمات کا جذبہ بھی اسی عمر سے رونما ہو گیا تھا۔ ابھی سن شعور کو بھی نہ پہنچے تھے کہ پہلی جنگ عظیم کی آگ بھڑک اٹھی اور جنگ ختم ہونے سے پہلے پہلے عالم عربی کے حصے تقسیم ہونے لگے۔ شام اور لبنان پر فرانسیسیوں کی نگاہیں للچائیں۔ اس وقت احتجاج میں مختلف مظاہرے ہوئے۔ ان میں علمائے حمص کا مظاہرہ بھی قابل ذکر ہے۔ اس وقت اس مظاہرہ میں مصطفیٰ سباعی بھی شریک تھے اور عمر صرف چھ سال تھی۔ ۱۹۲۷ء میں جب فرانسیسی اقتدار کے خلاف غم و غصہ کی عام فضا بن گئی اور ایک منظم انقلابی منصوبہ کی تکمیل ہوئی تو اس وقت بھی ڈاکٹر صاحب نے پوری جوانمردی سے کام لیا اور اخبار "المقطم" میں اس کی رپورٹیں پہنچاتے رہے۔

تعلیم و تربیت

ذہانت، طباعی، جرأت، علم کا شوق اور انہماک آبائی ترکہ میں ملا تھا۔ اس کے علاوہ جلیل القدر عالم اور باپ کی تربیت نے مزید چار چاند لگا دیے تھے۔

ابتدائی تعلیم گھر اور مکتب میں حاصل کرنے کے بعد معہد الشرعیہ سے بکالوریا[1] کی سند امتیاز کے ساتھ حاصل کی۔ اساتذہ سے ہمیشہ خراجِ تحسین حاصل کرتے رہے اور درجہ کے رفقا میں قابلِ رشک مقام حاصل کیا۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعہ ازہر کا سفر ہوا۔ موصوف حنفی المسلک تھے لیکن دوسرے مذاہب سے بھی بڑی حد تک دلچسپی تھی اور درس میں کافی طویل بحثیں ہو جاتی تھیں۔

بڑی جانفشانی، بے پناہ محنت اور بیدار مغزی کے ساتھ ازہر کی تعلیم مکمل کی۔ استاد سباعی مصر اور ازہر میں صرف ایک طالب علم ہی کی حیثیت سے نہ رہے بلکہ وہاں کی دینی، اخلاقی، اجتماعی اور سیاسی زندگی کا بھی انھوں نے بغور مطالعہ کیا اور اس پر ناقدانہ نظر ڈالی۔ وہاں کی اہم شخصیتوں، ادیبوں، الشاعروں، علماء، اور دینی رہنماؤں سے ربط و تعلق پیدا کیا اور تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔

ازہر کے دورانِ قیام اخوان المسلمین کی تحریک رو بہ پذیر ہو چکی تھی اور امام حسن البناء ایک مقناطیسی جاذبیت و کشش کے ساتھ مصری نوجوانوں اور تعلیم یافتہ طبقوں میں غیرت و حمیت، دینی جوش و ولولہ اور دعوت و تبلیغ کا صور پھونک رہے تھے۔ ڈاکٹر سباعی جیسا ہوشمند اور روشن ضمیر نے بے اختیارانہ اس دعوت کو قبول کیا اور اس کا

---

[1] ہماری ہندوستانی اصطلاح کے مطابق الف۔ اے کے مساوی۔

داعی بننے پر آمادگی ظاہر کی۔ امام حسن البنا کی مجلسوں، تقریروں اور جلسوں میں شریک ہوئے اور اخوان کا دعوتی رنگ قبول کرتے رہے۔ زورِ خطابت ورثہ میں ملا تھا، اس احساس نے اس میں مزید جلا پیدا کر دی۔

ان دنوں مصری نوجوانوں میں اصلاح عام، تحریکِ آزادی اور انگریز دشمنی کا جوش و جذبہ پورے شباب پر تھا۔ ڈاکٹر سباعی بھی اس میں کود پڑے اور بے شمار تقریریں کیں جن میں آزادی اور حریت کا مطالبہ کیا اور انگریزوں سے عالمِ اسلام کو پاک کرنے کا مطالبہ کیا۔ انگریزوں کو پتہ لگ گیا، آخرکار گرفتار ہوئے اور فلسطین کی چھاؤنی میں قید کر دیئے گئے۔ شروع میں ان کے والد بزرگوار کو معلوم نہیں ہوا، جب شیخ محمد الحامدؒ[1] نے بتایا تو مسکرائے اور فرمایا، تو کیا حرج ہے جیل تو مردوں ہی کے لیے ہے۔

اپنی درسی اور ازہری کتابوں اور اسباق کے ساتھ ساتھ خارجی مطالعہ بھی کیا کرتے تھے۔ مذاہب اور قوانین کے تقابلی مطالعہ کی طرف رجحان زیادہ رہا تھا۔ اسی وقت سے مستشرقینِ یورپ کی بہت سی کتابیں اور مضامین جو عربی میں منتقل کیے جا چکے تھے، پڑھنا شروع کر دیئے۔

---

[1] شام کے عظیم جلیل القدر عالم اور فقیہ۔

احمد امین کی کتاب فجر الاسلام" اور ضحی الاسلام کا بغور مطالعہ کیا اور اس میں بہت سی قابلِ اعتراض باتیں کھٹکیں۔ خاص طور پر ڈاکٹر احمد امین نے مشہور صحابی گولڈزیہر کے اقوال اور اس کی تحقیق سے استدلال پر ایک مضمون سپردِ قلم کیا اور اس دعویٰ کو باطل قرار دیا۔ شاید یہی ایک محرک تھا جس نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالہ کے لیے "السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی" کے موضوع پر آمادہ کیا۔

میدانِ عمل

شاہ سلیمان کے دورِ حکومت میں ترکی سلطنت کے زیرِ اقتدار آگیا تھا اور اس پر ترکی کا عمل دخل پورے طور پر ہوگیا اور ترقی کی شاہراہ پر ایک عرصہ تک گامزن رہا۔ لیکن ترکی حکومت کے روبہ زوال ہوتے ہی وہ ظلم وجبر کا شکار ہوا اور یورپین اقتدار کی زد میں آگیا۔ عربوں نے ترکی کو مردِ بیمار کا خطاب دے کر اس سے عربوں اور شامیوں کے دلوں میں نفرت و بیزاری کی آگ بھڑکا دی اور پورے عالمِ عربی میں خاص طور پر لبنان اور شام میں ایک اضطراب و بے چینی کی کیفیت چھاگئی جس کے نتیجہ میں جنگِ آزادی اور ترک بیزاری کی تحریکیں اٹھیں، بعد میں اس نے مختلف شکلیں اختیار کرلیں جن میں سے اکثر اسلام دشمن اور مسلم بیزار ہوگئیں، جن کی تفصیل کے لئے ان اوراق کا دامن تنگ نظر آرہا ہے۔

ان حالات میں ڈاکٹر مصطفےٰ سباعی کی زورِ خطابت، شیریں بیانی، شگفتہ خیالات، ستھرے اور پاکیزہ افکار، اخلاق اور اخلاقی کردار نے نوجوانوں اور عام مسلمانوں کو اپنا فریفتہ اور گرویدہ بنالیا۔ چند اپنے شہر حمص میں درس و تدریس اور اصلاح کا کام کرتے رہے لیکن ان کے عزائم اور بلند حوصلوں کے لیے وہ زمین تنگ نظر آئی تو دمشق منتقل ہو گئے اور وہاں ایک مثالی مدرسہ کی بنیاد ڈالی جس میں تعلیم کے ساتھ دینی تربیت کا خاص اہتمام تھا۔ اس مدرسہ کا نام "المعہد الاسلامی العربی" تجویز کیا۔ اب تک وہ دمشق میں قائم ہے اور اس کے تعلیم یافتہ طلباء اپنی دینداری اور روحانیانہ جذبات میں ممتاز ہیں۔

امام حسن البناء کی سیمابی نگاہوں نے ان کو ایک بلند فکر، نئی امنگ، اجتہادی شان اور دور اندیش نگاہ سے مالامال کرکے شام جیسے گلزار ملک کی طرف بھیجا۔ تا مصطفےٰ سباعی کی صلاحیتوں اور اصلاحی کارناموں سے حمص و حلب اور دمشق و حماہ کی سرزمین آشنا تھی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے مدرسہ کی ذمہ داری اور تدریس کے ساتھ ساتھ اصلاحی اور دعوتی کام جاری رکھا اور علمی و دینی مقالات لکھتے رہے مسجد میں وعظ و ارشاد اور گھروں میں دعوتی مراکز قائم کرتے تھے دمشق کے ایک قدیم دینی دار محلہ کی ایک مسجد الدرویشیہ کے صحن میں اس کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام شبان المسلمین رکھا۔

مرکز قائم ہو جانے کے بعد دعوتی کام کی رفتار تیز ہو گئی اور نوجوانوں اور دین دار حلقوں نے بڑے جوش و عقیدت سے مرکز کے جلسوں میں شریک ہونا شروع کیا۔ مصطفےٰ سباعی کی سحر آفریں تقریریں سب کو مسحور و گرویدہ کر لیتی۔ بہت جلد شبان المسلمین کے اراکین و ہمنوا دل کی تعداد ہزاروں تک پھیل گئی اور اس سے ڈاکٹر صاحب کی مقبولیت تیز تر ہوتی گئی۔ اس جمیعت کی بڑھتی ہوئی ترقی نے آخر میں الیکشن میں شرکت بھی ضروری سمجھی۔

تکمیلِ مطالعہ

دعوتی کام سے کسی قدر اطمینان ہوا تو سوچا کہ مقالہ پورا کر کے مصر سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کریں جس میں زیادہ پیش نظر مستشرقین کے اعتراضات کا جواب دینا تھا۔ اسی عرصہ میں السنۃ و مکانتہا کی تکمیل ہوئی۔ یہ کتاب مستشرقین کے حدیث پر بہتان و افترا اور جھوٹے الزامات کی تردید و استدلال پر مبنی ہے جو سنت کی بڑی قوت ہونے کے ساتھ معاشرتی اصلاح کے لیے بھی بہت زیادہ مفید ثابت ہوئی۔ اور آج تک اس کی تاثیر، تحقیق اور استدلال باعث تسلی ہے۔

دمشق یونیورسٹی میں بحیثیتِ استاد

دمشق یونیورسٹی کے LAW COLLEGE کو ایک عائلی قانون کے

استاد کی ضرورت تھی جس کے لیے نظر انتخاب ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی[1] پر پڑی اور اس میں ڈاکٹر صاحب بحیثیت استاد مقرر ہوئے۔ ان کے فاضلانہ، ناقدانہ اور استادانہ نظریات وخیالات سے طلباء کے ذہنوں کو نئی روشنی ملی۔ عائلی قانون کے ہوتے ہی اس قانون کی شرح لکھنی شروع کی جو اپنی افادیت اور وسعت کے اعتبار سے انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اب تک دو ضخیم جلدوں میں اس کے تین ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔ کتاب کا نام شرح قانون الاحوال الشخصیۃ ہے۔

پارلیمنٹ کی سیٹ

عالم عربی میں ان کی ہمہ گیر شخصیت قبولیت عام حاصل کرتی رہی اور عوام کی طرف سے شدید تقاضا ہوا کہ ڈاکٹر صاحب شامی الیکشن میں کھڑے ہوں اور اسٹیج سے عملی اصلاح کریں۔

اخوان المسلمین کی دعوت کا اصل مقصد بھی اسلامی قانون وحکومت کا نفاذ تھا۔ اس لیے اس مہم میں مزید طاقت پیدا ہوئی۔ سنہ ۱۹۴۹ء میں دینی عناصر کے نمائندہ کی حیثیت سے کھڑے ہوئے اور پورے ملک میں دوسرے نمبر پر کامیابی حاصل کی۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں ڈپٹی سپیکر مقرر ہوئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں ایک اسلامی اشتراکی گروپ کی بنیاد ڈالی اور ملک میں اسلامی قانون کے نفاذ کی کوشش کی جس کے نتیجہ میں ملک کے قانون کا بنیادی ماخذ اور اصل سرچشمہ فقہ اسلامی کو قرار دیا۔

---

[1] شام یونیورسٹی میں مصطفیٰ سباعی کی تقرری ۲ مارچ ۱۹۵۵ء دستور ۱۹۵۰ء دفعہ ۱۳

دمشق یونیورسٹی، کلیتہ الشریعہ کا قیام

شامی پارلیمنٹ نے ملک کے دستور میں جو ستمبر ۱۹۵۰ء میں نافذ ہوا تھا یہ تصریح کی کہ قانون کا اصل سرچشمہ فقہ اسلامی ہے اس لیے اس کی شدید ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ کوئی مستقل ایسا شعبہ یا ادارہ قائم کیا جائے جس میں ایسے علماء اور فقہاء پیدا کئے جائیں جو تفسیر و حدیث اور فقہ اسلامی اور اس کے مسائل و احکام میں عبور حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ یورپی قانون اور ملکوں کے نشیب و فراز، قوموں کے رجحانات و افکار، زمانہ کے مزاج و تقاضے اور اسلام کی روح و میلان سے خوب اچھی طرح واقف اور روشناس ہوں تاکہ وہ قانونی اور دستوری ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی انجام دے سکیں۔ اس وقت سے اس مجاہد اسلام اور امت مسلم کے مایہ ناز فرزند نے اس کی تحریک کی اور دمشق یونیورسٹی میں "کلیتہ الشریعۃ" کے نام سے مستقل ایک شعبہ یا ادارہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ لیکن کمیونسٹ اور الحادی گروہ اور عرب قومیت اور نیشنلزم کے دعویدار ممبران پارلیمنٹ نے بڑے تشدد اور قوت سے اس کی مخالفت کی بلکہ اس تجویز اور استاد سباعی مرحوم کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا گیا اور ڈاکٹر صاحب کے خلاف ایک ملک گیر پروپیگنڈا کی تحریک چلائی اور وزراء و حکام اور علماء تک کو ان کے خلاف لا کھڑا کر دیا۔ خیانت و غداری، نفاق، امریکی اور فرانسیسی اسلام، مذہبی

جیسے الزامات وافتراء پردازیوں سے انھیں نوازا گیا، لیکن مصطفیٰ سباعی نے ان سب طوفان اور آندھیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اس دور کے صدر جمہوریہ جناب ہاشم الاتاسی مرحوم کے سامنے کلیۃ الشریعہ کی تجویز پیش کر دی اور ان سے فوجی اور ملی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے یہ مطالبہ کیا کہ اپنے قلم سے اس کی منظوری دیں۔ چنانچہ انھوں نے منظوری دے دی۔ اور ۲۷ رمضان ۱۳۷۲ھ کو شامی پارلیمنٹ نے دمشق یونیورسٹی میں ایک نئے شعبہ کلیۃ الشریعۃ کے قیام کا قانون پاس کیا جس کی نظیر عالم اسلام کی کسی یونیورسٹی میں نہیں پائی جاتی۔
اس قانون کا اعلان ہونا تھا کہ مخالف جماعتوں اور فاسد عناصر میں بغض وعناد کا شعلہ بھڑک اٹھا، جو اس وقت سے آہستہ آہستہ ان کے دلوں میں سلگ رہا تھا۔ عالم عربی کی عربی قومیت کا مفکر اول اور بانی ڈسرپ (میشل عفلق) جو کیتھولک عیسائی ہے اور فرانس میں عقلی وفکری نشو ونما وتربیت حاصل کر کے شام کے ایک ہائی سیکنڈری سکول میں تاریخ اسلام کا استاد مقرر ہوا۔ پھر البعث العربی کے نام سے ایک پارٹی بنائی جس کا مقصد عرب قومیت اور جاہلی اقدار و کردار کو از سر نو زندہ کرنا ہے اور اس کی پارٹی نے جس کی ہمت افزائی شام کی کمیونسٹ جماعت کر رہی تھی، جس کا سربراہ ایک کردی النسل شخص خالد بکداسی تھا۔ اس قانون اور خیال کی بڑی زبردست مخالفت کی اور اس کے التوا میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

انھوں نے کہا کہ ایک ماڈرن اور جدید یونیورسٹی میں داڑھی اور جبہ نے کر آنے والے اس کی فضا کو مکدر کر دیں گے۔ لیکن مصطفےٰ سباعی جیسی قلندر صفت شخصیت اور مرد مومن نے اپنی بات منوا ہی لی اور مسلمانوں کا سر اونچا کر دیا۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۵۴ء میں باقاعدہ کلیۃ الشریعہ کا افتتاح ہوا اور اسی دن سے اس میں تعلیم جاری ہوئی۔

میدانِ جہاد

عالم اسلام میں فلسطین کا حادثہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے زبردست حادثہ تھا۔ اس خطرناک حادثہ کا احساس دنیائے عرب اور اسلام کو بہت پہلے سے ہو گیا تھا لیکن اس کی غفلت اور تن آسانی کی وجہ سے دنیا کی سب سے بدطینت قوم یہود سرزمین فلسطین کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ کر سکی۔ اس المیہ کی طرف قوم و ملک کے روشن ضمیر اور پاکیزہ افراد نے توجہ مبذول کرائی۔ اس میں جماعت اخوان المسلمین پیش پیش تھی جس کی قیادت سباعی مرحوم فرما رہے تھے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران انگریزوں کے واسطہ سے یہودیوں کو فلسطین میں قدم جمانے کے موقع مل رہے تھے۔

اس کے بعد مصطفیٰ سباعی مرحوم نے پورے ملک شام کا دورہ کیا اور فلسطین کے خطرناک قبضہ کو عوام کے سامنے پیش کیا جس سے قوم میں حرارت اور جوش و جہاد کا جذبہ پیدا ہوا۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہونے کے

بعد اخوان المسلمین نے ڈاکٹر صاحب کی قیادت میں تین میدانوں میں فلسطین کے لیے جدوجہد کی۔

۱۔ عرب لیگ اور اپنی حکومت و سرکاری مراکز کے سامنے رپورٹیں اور مطالبہ پیش کیا۔

۲۔ شہر، گاؤں اور محلوں میں عام اجتماع کئے۔

۳۔ عملی طور پر انھوں نے اپنے نوجوانوں کو دریافتِ حال کے لیے فلسطین روانہ کیا تاکہ وہ یہود کی ریشہ دوانیوں اور ان کے حوالوں کا بغور مطالعہ کریں۔ ان نوجوانوں نے یافا، تل ابیب، جفا، بیت المقدس اور یہودی نوآبادیوں کا دورہ کیا اور جب ۱۹۴۸ء میں تقسیم فلسطین کا سانحہ پیش آیا تو مصطفٰی سباعی مرحوم اور ان کی جماعت اخوان المسلمین نے اپنی شاندار اور ولولہ انگیز تقریروں اور تحریروں سے پورے عالم عرب میں نئی زندگی پھونک دی۔

تھوڑے سے بہت اسلحہ کا انتظام کیا اور جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہو گئے۔ اس معرکہ میں کئی مرتبہ سباعی صاحب خطرناک اور نازک حالتوں سے گزرے لیکن اللہ تعالیٰ کو ابھی ان سے بہت کام لینا تھا، بچ گئے، زخم کئی لگے لیکن مہلک ثابت نہیں ہوئے۔ اس مردِ مجاہد نے قلم اور زبان کے جہاد کے ساتھ شمشیر و سناں کے جہاد میں بھی شریک ہو کر قرنِ اول کے مسلمانوں کی یاد تازہ کر دی۔

پاکستان نے ۱۹۵۱ء میں ایک عالمگیر پیمانہ پر اسلامی کانفرنس منعقد

کی جس میں مشرق و مغرب کے ہر مکتب خیال و فکر کے لوگوں کو مدعو کیا۔ ڈاکٹر سباعی اپنے وفد شام کی قیادت میں تشریف لے گئے اور وہاں اپنا سکہ جمایا۔ پاکستان سے ڈاکٹر صاحب کو غیر معمولی لگاؤ تھا اور اس کے لیے دعائیں کرتے تھے۔

اسی طرز کی دوسری کانفرنس ۲۲ سے ۲۷ اپریل ۱۹۵۴ء میں لبنان کی تفریح گاہ "بحمدون" میں امریکی انجمن احباب برائے مشرق وسطیٰ کی طرف سے منعقد کی گئی۔ اس میں عالم عربی اور دنیائے اسلام کے وفد اور مندوبین خاص طور پر مدعو کئے گئے۔ مقصد یہ تھا کہ دنیا کے اسلام اور مسیحیت کا روسی کمیونزم کے خلاف ایک عالمگیر محاذ بلاک بنایا جائے۔ اس سلسلہ میں جو مقالہ پیش کیا گیا وہ انتہائی تکلیف دہ تھا جو عرب مندوبین کے لیے احتجاج کا باعث بنا اور انھوں نے زبردست احتجاج کیا۔ اس پر سباعی صاحب کو مقالہ پیش کرنے کا موقع دیا اور انھوں نے منتشر ذہنوں کو جوڑ دیا۔

یورپ و روس کے سفر

دمشق یونیورسٹی ڈاکٹر مصطفٰے سباعی کو کلیۃ الشریعہ کے پرنسپل منتخب کیے جانے کے بعد ہی یورپ بھیجنا چاہتی تھی تاکہ وہاں کی یونیورسٹیوں کی تعلیم، نصاب، درس اور شعبہ ہائے علوم کے اداروں سے تعارف و تبادلہ خیال کریں، لیکن یہ سفر خود ڈاکٹر صاحب کی دعوتی اور اصلاحی

مشغولیتوں اور دوسرے عوارض کی بنیاد پر ملتوی رہا اور ۲۳ مارچ ۵۶ء
کو ڈاکٹر سباعی یورپ روانہ ہوئے۔
یورپ کے سب ہی ملکوں کا دورہ کیا اور اس کی ساری یونیورسٹیوں
علمی مراکز اور ثقافتی اداروں اور شعبوں کی زیارت کی اور اس کے ذمہ
داروں سے کھل کر صاف گفتگو اور تبادلہ خیال کیا۔ بے انتہا جرأت و
آزادی کے طریقہ پر ان کے طرز فکر پر تنقید کی۔ ان سب حلقوں کو دعوت
دی کہ وہ اسلام کا صاف اور ستھرے ذہن سے مطالعہ کریں اور پچھلی
غلط فہمیوں اور تلخیوں سے کنارہ کش ہو کر حق و انصاف کی کسوٹی پر اسلام
کو جانچیں اور پرکھیں۔ سباعی مرحوم نے مستشرقین یورپ سے خاص طور
پر ملاقات کی جن کا خلاصہ کتاب میں لکھ دیا گیا ہے۔

تصنیف وصحافت

ڈاکٹر سباعی نے اپنی دوسری اصلاحی سرگرمیوں کے ساتھ پاکیزہ
اور ستھری صحافت کے لیے بے حد کوشش کی مگر خاطر خواہ فائدہ حاصل
نہ ہوا چنانچہ ۱۹۴۸ء میں انھوں نے خود ایک سیاسی روزنامہ "المنار"
کے نام سے جاری کیا جس کے وہ خود مدیر تھے اور ۱۹۵۰ء تک رہے
اس میں سباعی صاحب کے جو مضامین و اداریئے شائع ہوئے اس
سے ان کی سیاسی بصیرت نمایاں ہے۔ سیاسی مسائل کا بڑا ادراک
اور گہرا تجربہ رکھتے تھے اور بڑی جرأت و بے باکی سے حکومت

اور سیاسی لیڈروں پر بھی تنقید کیا کرتے تھے جس میں کسی قسم کی جانب داری، چاپلوسی اور مداہنت نہیں ہوتی تھی۔ اسی طرح سباعی صاحب نے پاکیزہ اور غیر جانبدارانہ صحافت کا عملی نمونہ پیش کیا جو ہمیشہ کے لئے سنگ میل اور نشانِ راہ کا کام دیتا رہے گا۔

اس کے بعد جماعت اخوان کی طرف سے "الشہاب" جاری ہوا جس کو اپنی رہنمائی اور مشوروں سے نوازتے رہے ۱۹۵۱ء میں جب شام کی بعثی حکومت نے ڈاکٹر سعید رمضان کو شام چھوڑ دینے پر مجبور کیا گیا تو کچھ عرصہ بعد رسالہ "المسلمون" کو بھی بند کر دینے کا حکم صادر کر دیا۔ اس کے بعد سباعی صاحب نے "حضارۃ الاسلام" بڑی جد و جہد کے بعد نکالا۔

سباعی صاحب کی تحریر میں بڑی سحر انگیزی، تاثیر اور ادبی لطافت پائی جاتی ہے پیچیدہ اور سخت و دشوار موضوع کو آسان اور پر لطف بنانے میں ان کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ یہ چیز تحریر و تقریر دونوں میں نمایاں پائی جاتی تھی۔

اخلاق و تزکیہ نفس

سینکڑوں سال سے سباعی صاحب کا گھرانہ علم دین کا گہوارہ تھا۔ ان کے والد حسنی السباعی مرحوم ایک عالم دین اور جہاندیدہ بزرگ تھے۔ اس دور کے عارفین سے گہرا ربط رکھتے تھے اور ہمہ وقت انھیں کی مفید اور بافیض مجلسوں میں رہتے اور دنیا و نفس کی گندگیوں

سے کنارہ کش رہنے کی کوشش کرتے۔ ڈاکٹر سباعی کو بھی ان کے والد نے اسی طرح کی تربیت کی اس لیے بچپن سے ان کا رجحان اخلاق و سلوک کی طرف تھا اور نیک و صالح بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ سباعی صاحب کو اسلام پر گہرا اور پختہ یقین و ایمان حاصل تھا۔ اس کے لیے ہمہ تن و ہمہ وقت تیار رہتے تھے اور زندگی کے کسی لمحہ میں بھی اس سے غافل نہیں ہوتے۔

بڑے بلند اخلاق اور پاکیزہ کردار کے حامل تھے۔ ہر شخص سے محبت و خلوص کا رشتہ رکھتے تھے اور ہمیشہ مسکراتے ہوئے ملتے تھے۔ کسی کو بھی پژمردہ کو دیکھ کر خوش کرنے کی کوشش کرتے۔ روحانیت و تقویٰ کی طرف قلبی میلان تھا۔ اسی سلسلہ میں کئی پرمغز دعوتی مضامین لکھے۔

البتہ انھوں نے اس تصوف پر تنقیدیں بھی کیں جس میں عجمیت پائی جاتی ہے جو تعلق مع اللہ کے بجائے وحدۃ الوجود یا دین فروشی کا سبب بنتا ہو۔ ڈاکٹر سباعی شام کے عارف باللہ شیخ احمد ہارون الحجاز سے بیعت تھے اور ان کی روحانیت سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ انھوں نے اس سلسلہ میں ان سے کافی فیض حاصل کیا۔

امام حسن البنا کی شہادت کے بعد ان کی جانشینی کے لیے جو نام پیش کیے گئے تھے ان میں ایک نام سباعی صاحب کا بھی تھا۔ اس لیے وہ شامی اخوان کے صدر اخیر عمر تک رہے۔ جماعت کا ہر فرد ان سے بے انتہا محبت و خلوص رکھتا تھا۔ ۱۹۵۷ء میں اخوان کی حیات و

موت وکی کشمکش کے عالم میں اخوان کی بڑی دانشمندی سے قیادت کی اور کامیابی کے ساتھ کشتی کو پار لگادیا۔

بیماری اور وفات

اسی دوران بے پناہ ضعف نے ان کی صحت پر اثر ڈالا اور فالج کا بڑا سخت حملہ ہوا۔ بدن کا بایاں حصہ شل ہو گیا اور اس کے علاج و معالجہ میں مزید سات سال گزرے اور اسی دوران اللہ نے مزید کام لیا اس وقت انھوں نے اپنی تمام تصنیفات کو یکجا کیا اور شائع کرایا۔ انکی حالت میں علمی مشغولیتیں دوگنا ہو گئیں۔

جب درد والم زیادہ ہوتا، گریہ وزاری کرتے اور مناجات میں مشغول ہو جاتے۔ آخر عمر میں خشوع وخضوع اور توجہ الی اللہ بہت زیادہ بڑھ گئے۔ مدینہ منورہ میں مستقل قیام کا ارادہ کیا، حج کیا اور دوبارہ رخت سفر باندھنا چاہا لیکن یہ آخرت کے سفر میں تبدیل ہو گیا، مرض شدید ہوا اور ۲۷ جمادی الاولی ۱۳۸۴ھ کو ظہر کے وقت اچانک انتقال ہو گیا۔

ان کی موت کے بعد وہ تمام مناظر سامنے آئے جو کسی سچے، مقبول اور برگزیدہ بندے کے لیے مخصوص ہیں۔

جنازہ میں شرکاء کی کثرت، دعائیں اور والہانہ جذبات آج بھی

فضا میں موجود ہیں اور اس مردِ مجاہد کی مقبولیت و بزرگی کا اعلان کرتے ہیں۔ اِلَی الْجَنَّۃِ یَا سَبَاعِیْ

نوٹ : ۱۹۶۴ء میں ہمارے فاضل مضمون نگار مولانا محمد اجتباؑ ندوی نے ڈاکٹر سباعی مرحوم کی شخصیت پر ایک طویل مضمون سپردِ قلم کیا تھا۔ ان صفحات پر لکھے گئے حالات بڑی حد تک انہی کے مضمون کی تلخیص ہے۔

کچھ اہم دینی کتابیں

خود پڑھئے اور گھر والوں کو پڑھائیے

کتاب	مصنف	قیمت
آدابُ النبیؐ	از حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ	۶/-
اسلامی آداب	حضرت مفتی عاشق الٰہی صاحب	۱/۸۰
نماز اور اس کے مسائل	مولانا محمد محترم فہیم عثمانی	۶/-
فلسفۂ نماز	مولانا قاری محمد طیب صاحب	۹/-
دینی مسائل	مولانا سید اصغر حسینؒ	۶/-
دستِ غیب	" " "	۶/-
نصیحت نامہ	" " "	۶/-
آفتابِ نبوت	مولانا قاری محمد طیب صاحب	۳۰/-
سوانح مولانا روم	مولانا سید اصغر حسینؒ	۴/۵۰
تجلیاتِ مدینہ	مولانا احتشام الحسن کاندھلوی	۱۳/۵۰
سال بھر کے مسنون اعمال	حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ	۲/۵۰
روایاتِ طیب	مولانا قاری محمد طیب صاحب	۴/۵۰
پردہ کے شرعی احکام	حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ	۱۰/۵۰
شرعی پردہ	مولانا قاری محمد طیب صاحب	۴/۵۰
اسلام میں مشورہ کی اہمیت	حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ	۱/۵۰
معارف گنگوہیؒ	مولانا محمد اقبال قریشی صاحب	۶/-

طلب فرمائیے: ادارۂ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور